

عجیب شخص ام

آمنہ اقبال احمد

PP
PAKISTANI
POINT



پاکستانی پوائنٹ

عجیب شخص ہے

آمنہ اقبال احمد

ارسلان بُک کارپوریشن

اُردو بازار لاہور

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

2009ء

ارسلان بک کارپوریشن

ناشر: تبین خشک

نام کتاب: _____ عجیب شخص ہے

مصنفہ: _____ آمنہ اقبال احمد

کمپوزنگ: _____ جگمیری کمپوزرز اینڈ ڈیزائنرز

مطبع: _____ آصف یاسین پریس، لاہور

تعداد: _____ 600

اسٹاکسٹ

7320315

Mob: 0333-4325758, 0301-4072442

پیشہ زائید بکسٹرز

طیبنہ بکسٹال

اپنی بات

میں اپنے پڑھنے والوں کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر میری کتابیں پڑھیں اور انہیں پسند کیا۔ وہ شہر پر میری کافی حوصلہ افزائی ہوئی ہے عجیب شخص ہے، بھی اسیر ہے پسند آئے گی۔

مادری زبان پشتو ہونے کی وجہ سے اردو لکھتے وقت کئی مسائل پیش آتے ہیں۔ جن کو میں بہر حال ٹھیک کرنے اور آپ کے پڑھنے کے قابل بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اب بھی کئی غلطیاں ہوں گی۔ امید ہے درگزر کریں گے۔

آمنہ اقبال احمد



**Some day winter will ask summer;
'Have you seen spring lately?'**



کاؤنٹر سے آنٹی کے لئے کوئی اور اپنے لئے جوس ٹرے میں لے کر وہ مڑی۔ اور نئے تلے محتاط قدم اٹھاتی ڈائینگ سیکشن کے پتوں بچ چھوڑے گئے راستے پر آنے لگی۔

ایک ہل کور کی۔ سامنے دیکھنے کو۔ آنٹی کہاں بیٹھی تھیں۔ یہ معلوم کرنے کو۔ مگر نظریں زیادہ دور نہ جاسکیں۔

چند ہی قدم پر۔ اُسی کی جانب ایک آدمی بڑھ رہا تھا۔

اس کی چال دھیمی تھی۔ انداز خود اعتمادی لئے تھا۔

اس کی آنکھوں میں اتھارٹی تھی۔ شخصیت میں کسی مطلق العنان فرمانردا جیسا

کمانڈ تھا۔

نظروں میں ایک ایسے اختیار کی جھلک تھی جو اس کی قوت کا پتہ دیتا تھا کسی بھی شعبے میں، کوئی بھی کاروبار جو وہ کرتا تھا۔

شخصیت میں ایسے حاکم کا دبہ تھا جس کی طاقت لامحدود ہو، جس کے احکام بلا چوں و چرا بجالائے جاتے ہوں۔

اونچے قدم اور چوڑے شانوں پر سفید بے داغ قیمتی سوٹ زیب تن کئے۔

وہ شاہانہ وقار سے آہستہ آہستہ اسی کی سمت آ رہا تھا۔

ارد گرد سے بے نیاز۔ آس پاس سے بے خبر۔ وہ قریب آ گیا تھا۔ دو تین

قدم پر۔

معا اس کی نظر ناجیہ پر پڑی۔ ایک ہل کو وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

پھر اس کی نظریں اس کا جائزہ لینے لگیں۔ نیچے سے لے کر اوپر تک، پاؤں

سے لے کر سر کے بالوں تک۔

نیلی پھولدار شلوار، اسی طرح کی قمیض، نیلا دوپٹہ، گھٹنوں تک لمبے بھیکے بال۔

وہ کچھ ان ایزی سامجوس کرنے لگی۔ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

چند ثانیے پہلے والا اس کا بارعب چہرہ سایوں کی زد میں آ گیا تھا۔

اتھارٹی سے بھرپور اس کی سنون گرے آنکھوں میں حقارت سی اتر آئی تھی۔

پتہ نہیں کیوں، وہ سہم سی گئی۔

کتر اکرا ایک طرف سے ٹھکنا چاہا۔ مگر۔۔۔ بدحواسی میں اسی سے جا ٹکرائی۔

جس چھٹک کر اس کے بے داغ کوٹ کی آستین پر جا گرا۔

اس نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

حقارت کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔

”اپنے حواس میں رہا کریں۔ یہ شپ ہے آپ کا گھر نہیں۔“ وہ جیسے بڑی

ضبط سے بولا تھا۔

گویا ارد گرد اور لوگوں کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا تو یقیناً ایک زوردار تھپڑ

رسید کر دیتا۔

”I am very sorry.“ اُسے کہنا ہی پڑا۔

گو کہ اس کا قصور اتنا بڑا نہیں تھا جتنی کہ وہ تو جین کر رہا تھا۔

”Now go away.“ اس کی موجودگی جیسے اس کی برداشت سے باہر

ہو رہی تھی۔

وہ آگے بڑھ آئی۔ آنٹی کی طرف۔

بہت بڑے لاؤنج میں ڈائننگ سیکشن کو چھوڑ کر اس طرف کھڑکیوں کے قریب جگہ جگہ آرام دہ گدے دار کرسیاں اور میز رکھے تھے۔ یہیں ایک طرف لائبریری تھی۔ شیلنوں میں بے شمار کتابیں، رسائل و اخبارات رکھے تھے۔

آنٹی بھی ایک رسالہ لے کر آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

قریب آ کر اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ خود آنٹی کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تمہارا جوس تو آدھے سے بھی کم رہ گیا ہے۔“ آنٹی کسی بھی بات سے بے خبر کئی کام اٹھاتے ہوئے خاصی صاف اردو میں بولیں۔

”ہی... نہ کر لگ گئی تھی۔“ اُس کی آنکھیں اپنی تو جین کے احساس سے نم سی ہونے لگی تھیں۔ جلدی۔ رہا سہا جوس منہ سے لگا لیا۔

”اور لے آئیں۔“

”کافی ہے۔“ اس نے خوبصورت آنکھوں جھپک لیں۔

جوس پیتے پیتے اس کی نظریں سامنے اٹھیں۔

کوئی کام ہاتھ میں لئے کاؤنٹر سے نکا کھڑا وہ اسے ہی کھ رہا تھا۔

مگر۔ اب آنکھوں میں وہ دالی وحشت نہیں تھی۔

چہرے پر وہ کڑختی بھی نہ رہی تھی۔

بس گہری سنجیدگی تھی۔ گہرا سناٹا تھا۔

اتھارٹی البتہ اب بھی وہیں کہیں بھٹک رہی تھی۔ کمانڈر اب بھی آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔

اس نے نظریں اپنے گلاس پر جمالیں۔

آئی نے کوئی ختم کی تو دونوں میٹریاں اترتی نیچے آ گئیں۔

آئی کو ان کے کیبن پر چھوڑ کر وہ کارپنڈ کو ریڈور میں سے ہوتی اپنے کیبن میں آ گئی۔

چھوٹا سا خوبصورت کمرہ تھا۔ نیلے رنگ کا قالین بچھا تھا۔ اسی کے ہمرنگ پھولدار پردے تھے۔ ایک طرف آرام دہ بستر تھا۔ کھڑکی کے پاس میز اور ساتھ ہی کرسی رکھی تھی۔ دوسری طرف وارڈرو ب تھا۔ کونے میں پردہ ہٹا کر واش بیسن، بڑا سا شیشہ، فیلپ اور دروازے تھے۔ چھوٹا سا کمرہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔

پچھلے ہی دنوں اس کے بی اے کے امتحان کے بعد اس کی چھٹیاں اور ابو کا لنڈن کا پروگرام ساتھ ساتھ بنا تھا۔ حسب وعدہ وہ اسے بھی ساتھ لیتے آئے تھے۔ انکل مصطفیٰ ابو کے جگر دوست، عرصہ دراز سے بزنس کے سلسلے میں لنڈن میں مقیم تھے۔ وہیں ایک حبشی نژاد انگریز خاتون سے شادی کی تھی۔ دونوں بیٹیاں بیوی نے ناجیہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ابو اگرچہ ہوٹل میں مقیم تھے مگر ناجیہ کو ان لوگوں نے اپنے ہی پاس رکھا۔

انکل کا ایک ہی بیٹا تھا مجتبیٰ۔ انہی دنوں امریکہ سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری لے کر لوٹا تھا۔ ایڈ آر می میں بریگیڈیئر تھے اور آر می ہی کی طرف سے لنڈن آئے تھے۔ سارا سارا دن مصروف رہتے۔ ان لوگوں کو وقت ہی نہ دے پارہے تھے۔ پھر چند روز لنڈن میں رہ کر جب وہ فرانس جانے لگے۔ تو آئی مصطفیٰ نے ناجیہ کو ساتھ لے کر مجتبیٰ کی ہمراہی میں شپ سے دریائے رائین کنیر کی ٹھان لی۔

دریائے رائین — جو یورپ کے وسط میں سے گزرتا تھا۔ اور شپ — جو

انہیں ایمسٹرڈم، ہالینڈ سے لے کر جرمنی فرانس اور سوئٹزرلینڈ تک کی سیر کروانا۔

شب۔ جو چھٹیاں اور تفریح منانے والوں کے لئے مخصوص تھا۔

وہ تینوں لنڈن سے بذریعہ ٹرین ہاروج اور ہاروج سے فیری کے ذریعے
تاتھ سی کر اس کر کے ہک آف ہالینڈ پہنچے تھے۔ اور پھر۔ ابھی چند گھنٹے قبل ایک
بس انہیں وہاں سے یہاں ایمسٹرڈیم کی بندرگاہ پر لے کر آئی تھی۔

ایمسٹرڈیم۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اس نے دیکھا۔ بندرگاہ، پانی اور دور
اس پار اونچی عمارتوں کا سلسلہ۔ یہ ایمسٹرڈیم تھا۔

اس نے پردے کھلے چھوڑ دیئے۔ ایک نظر شب سے ٹکراتی موجوں پر ڈالتے
ہوئے وہ اندر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اپنا سوٹ کیس کھولا۔ وارڈروب میں کپڑے لگائے۔ بیک سے باقی چیزیں
نکال کر کونے میں لگے بڑے سے شیشے کے آگے اور درازوں میں رکھیں۔ خالی
سوٹ کیس اور بیک کو وارڈروب میں ایک طرف رکھا۔

اور۔ فارغ ہو کر کیمین لاک کرتے ہوئے کوریڈور میں نکل آئی۔ آنٹی کے
کیمین کی طرف جاتے جاتے اسے تھوڑی دیر قبل اوپر لاؤنج والا واقعہ یاد آ گیا۔
سرجھٹک کر اس نے تنخی بھلانا چاہی۔ اور پھر۔ مجتبیٰ کی اوٹ پٹانگ باتوں
میں وہ واقعی سب بھول بھال گئی۔

لنچ پردہ لوگ دوبارہ اوپر گئے۔ ڈائیننگ ایریا میں چار چار افراد کے لئے
ایک ایک میز مخصوص تھی۔ اسے کچھ مایوسی سی بھی ہوئی۔ کیمینوں کی طرح یہاں بھی
اسے الگ میز پر رکھا گیا تھا۔ مگر اس طرح کہ قریبی میز کی قریبی کرسی پر مجتبیٰ اور
اس کے پاس والی کرسی پر آنٹی تھیں۔ دوری کا احساس جاتا رہا۔

آنٹی اور مجتبیٰ اور اس کے پاس ایک معمر انگریز جوڑے کی جگہ تھی اور اسی
طرح اس کی میز پر بھی ایک ادھیڑ عمر انگریز ہی جوڑا آ کر بیٹھا تھا۔

”مسنلزے مارٹن“ ادھیڑ عمر عورت اپنا تعارف کرانے لگی تھی۔

“And this is my husband Frank Martin”

“Najia Ahmad, from Pakistan”

وہ مسز مارٹن سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

کھانا لگ چکا تھا۔ تینوں نے کھانا شروع کر دیا۔

چوتھی سیٹ خالی تھی۔ مسز مارٹن اپنے شوہر سے کہہ رہی تھیں کہ چوتھی سیٹ شاید خالی ہی رہے گی۔ ابھی تک کوئی آیا نہیں تھا۔

کھانے کے بعد وہ آنٹی اور مجتبیٰ کے ساتھ نیچے آ گئی۔ آنٹی نے اسے اپنے کیمین میں روکنا چاہا۔ مگر وہ سخت تھکی ہوئی تھی۔ معذرت کرتے ہوئے اپنے کیمین میں آ گئی۔

بستر پر لیٹے لیٹے اس نے کھلی کھڑکی سے باہر نگاہ کی۔

شب اب بھی ہاربر پر لگا تھا۔ بالکل متوازن تھا۔ بس کبھی کبھی کسی اور شپ کے پاس سے گزرنے پر قدرے ڈانواں ڈول ہو جاتا اور اس کے گزر جانے کے بعد پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا۔

نرم نرم نکیوں میں سروے کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ تھکی ہوئی تو تھی ہی جو سوئی شام کو ہی دروازے پر دستک سے آنکھ کھلی۔

دروازہ کھولا۔ مجتبیٰ تھا۔ ڈنر پر بلارہا تھا۔

”آپ چلے میں آتی ہوں۔“

ڈنر گونگ اب بھی ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر منہ دھویا۔ صبح کے دھوئے کھلے بالوں میں برش کر کے ڈھیلی سی چوٹی بنائی۔ اور کیمین لاک کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

کوریدور کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ عمدہ قسم کے فریشنر کی مدھر خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔

وہ کیمین نمبر 26 پر آ گئی۔ آنٹی اور مجتبیٰ اسی کے منتظر تھے۔ تینوں میز حیاں

چڑھ کر اوپر لاونچ میں آ گئے۔

چکا چونہ کر دینے والی روشنیاں تھیں۔ پرفیوم اور سگریٹوں کی مہک تھی۔
موسیقی کی روح پروردھنیں تھیں۔ ہنسی تھی۔ قہقہے تھے۔ زندگی ہی زندگی تھی۔
آنٹی اور محبتی اپنی میز پر وہ اپنی میز پر بیٹھ گئی۔ اس کی میز پر انگریز جوڑا پہلے
سے آچکا تھا۔

ڈاننگ ایریا تیزی سے پُر ہو رہا تھا۔ لوگ میزوں کے گرد تقریباً بیٹھ چکے تھے۔
متعدد ویٹریسز ادھر سے ادھر کھانا سرو کرنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان کی میز
پر بھی کھانا لگ چکا تھا۔

تینوں نے کھانا شروع کر دیا۔
تبھی۔ چوتھی کرسی پیچھے کھسنے کی آہٹ پر اس کی محویت ٹوٹی۔
جھکا سر اٹھا کر دیکھا۔

وہی آدمی تھا۔

وہی اتھارٹی تھی نظروں میں۔ سریم خود اعتمادی تھی انداز میں۔
اس کے بالکل سامنے والی کرسی کی پشت تھاے کھڑا تھا۔
اس کا دل دھڑک اٹھا۔

“My name is Jan -e- Alam. I belong to
Pakistan.”

بیٹھنے سے پہلے اس نے انگریز جوڑے سے باری باری ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا
تعارف کرایا۔

پھر۔ ایک نظر بغور تاجیہ کی آنکھوں میں دیکھا اور باوقار انداز میں کرسی پر
بیٹھ گیا۔

انگریز جوڑے نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ دونوں میاں بیوی متاثر سے نظر
آنے لگے تھے۔

تیزی سے ایک ویٹر بس پاس آئی اس کے آگے مستعدی سے کھانا لگانے لگی۔
 ناجیہ سے اب کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا۔
 جانے کیا تھا اس کی شخصیت میں؟ اس کے انداز میں؟
 وہ نوالہ بھول بھول گئی۔

”آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ ایک بھاری سنجیدہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

جھک سرائٹھا کر وہ اسے دیکھنے لگی۔

پھیلی پھیلی سی آنکھوں سے۔

وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھر وہی تاریک سایہ لرز رہا تھا۔
 آنکھوں میں تضیک آمیز چمک تھی۔

ایک بار پھر۔ وہ سہم گئی۔

”ناجیہ۔ احمد“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

اس کے پرکشش، بیہوشانہ پر بے حس سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

”From?”

اُسے یقین تھا وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں سے تعلق رکھتی ہے۔ چند گھنٹے قبل وہ
 یہیں اسے مل چکی تھی۔ اس کی بات چیت اس کا لباس بتا سکتے تھے کہ وہ کہاں کی
 رہنے والی ہے۔ خاص طور سے جب وہ خود بھی پاکستان کا رہنے والا تھا۔

پھر؟ وہ کیوں کہلوانا چاہتا تھا اس سے؟

”پاکستان“ اس نے بمشکل اضافہ کیا۔

اس کی آنکھوں کی اتھارٹی میں کرب کھل گیا۔ پریم خود اعتمادی نظر آنے لگی۔

کیوں تھا ایسا؟ اس نے ایسی کون سی بات کہہ دی تھی۔ جو اُسے ناگوار گزری
 بلکہ۔ جو اُسے مجروح کر گئی۔

کیا لفظ ’پاکستان‘ میں کوئی بات تھی؟

اودہ۔ جیسے وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ لنڈن میں اس نے محسوس کیا تھا لوگ پاکستانیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انگلش جوڑے کے سامنے شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان کا ذکر ہو۔ ہونہہ Complex تھا۔ مگر۔ اسے پھر حیرت ہوئی۔ ابھی اس نے اپنا تعارف بھی تو پاکستان کے نام سے ہی کروایا تھا۔

پھر کیا بات تھی؟

چند تھکنے بیشتر بھی وہ اس سے کچھ اچھا پیش نہیں آیا تھا۔ شاید تھا ہی ایسا۔ اکھڑا اور مغرور۔

دولت مند تھا۔ جیسا کہ اس کے انداز سے لگتا تھا۔

مغرور تھا۔ شاید اس لئے کہ دولت کے ساتھ ساتھ بے پناہ پرکشش پرسنلٹی پائی تھی۔

جسبی تو انگریز جوڑا متاثر نظر آ رہا تھا۔ جسبی تو ایک مخصوص ویٹریس خاص طور سے اسے اینڈ کر رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا کورس سرو کئے جا رہی تھی۔ ورنہ تو باقی پسینہ سارے خود ہی لے لے کر کھا رہے تھے۔ کانٹے سے پلیٹ میں لیکریس بناتے بناتے اس نے پھر نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس کی آنکھوں کی اتھارٹی آہستہ آہستہ معمول پر آ رہی تھی۔ خود اعتمادی دیرے دیرے بحال ہو رہی تھی۔ مضبوط جڑے گر چہ اب بھی سختی سے جڑے تھے۔ اور سوپ پی لینے کے بعد وہ اگلے کورس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے پھر سر جھکا لیا۔ کھانے کی کوشش کرنے لگی۔

سزمارٹن کچھ بولی تھیں شاید۔

”ہوں۔ Yes۔“ جان عالم بولا تھا۔

اور پھر۔۔۔ وہ ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

اس کے بولنے کا انداز بہت دلکش تھا۔

دھیما دھیما۔ دلنشین۔

وہ کم بول رہا تھا۔ مختصر جملے، پر معنی، دلچسپ۔

کچھ دیر قبل کے اس کے چہرے پر تاریکی کے سائے، آنکھوں میں تھخیک یا کرب کا اب شائبہ بھی نہ تھا۔

تو کیا اس کی ناگواری، بے اعتنائی صرف ناجیہ کی ذات تک محدود تھی؟

پر کیوں؟ وہ تو اسے جانتا تک نہیں تھا۔

پھر اس نے خود ہی اپنی سوچ کی تردید کر دی۔ اتنی اہم چیز...

اہم چیز؟ کیا وہ اہم تھا؟ تھا تو۔۔۔ اتنا لمبا چوڑا۔۔۔ مدد پر بارعب سا۔ واقعی اتنی

اہم چیز کو اس سے کیا لینا دینا؟

اچھا یا برا۔ دونوں رویے ہی اس شخص کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں جس

سے کوئی تعلق ہو۔ یا کم از کم اسے جانتا تو ہو۔

اس نے ذہن سے خیال جھٹک دیا۔ پھر سے کھانے میں مصروف ہو گئی۔

ویٹریس آئی تھی۔ جان عالم کی پلیٹ میں کچھ ڈال رہی تھی۔

جان عالم نے اس سے ڈچ زبان میں کچھ کہا تھا۔ ڈچ ہی ہوگی۔ کیونکہ فرنیچ

کا اسے تھوڑا بہت اندازہ تھا۔ اور پھر ایمسٹرڈیم کی ویٹریس تھی ڈچ ہی بولا ہوگا۔

جان عالم کو ڈچ زبان آتی تھی۔ ناجیہ کو کوئی خاص حیرت نہ ہوئی۔

وہ شاید کچھ بھی جان سکتا تھا۔ اس کی بھرپور خود اعتمادی کہہ رہی تھی۔ رعب

اور دبدبہ بول رہا تھا۔

ویٹریس جواب میں جانے کیا بولی۔

ایک جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

مارے حیرت کے گھبرا کر وہ اسے دیکھنے لگی۔

وہ تو انسان تھا۔ ہنسنا بھی جانتا تھا۔

اس کی سٹون گرے آنکھیں تاجیہ کی آنکھوں سے ملیں۔

قہقہہ اچانک ہنسنے لگا۔ پرکشش ہنسنے لگا۔ نقوش تاریکیوں میں ڈوب گئے۔
اور۔۔۔ تاجیہ کو لگا۔

وہ اس آدمی پر بوجھ تھی۔ کیسے؟ یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ مگر تھی یقیناً۔

ویٹریس جا چکی تھی۔ سب پھر کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔

لاؤنج میں کراکری اور کٹری کا شور تھا۔ ہنسی اور قہقہوں کا ہجوم تھا۔

خاموشی بھی تو صرف تاجیہ کے لبوں پر۔ سکوت تھا تو صرف اسی کے من میں۔

”آپ دونوں پاکستان کے رہنے والے ہیں۔ مگر آپس میں بہت کم بول رہے ہیں۔“ باتونی سی مسز مارٹن مسکراتے ہوئے انگریزی میں بولیں۔

تاجیہ گھبرا کر جانِ عالم کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہم مشرق کے رہنے والے ہیں۔“ اس کی نظریں تاجیہ پر گڑی تھیں۔

”وہاں حیاتی لڑکی کا سب کچھ ہوتی ہے۔ اور۔۔۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ مس احمد مجھ سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہیں کریں گی۔“

اوہ۔۔۔ اسے اپنی توہین کا شدید احساس ہوا۔

وہ تو مسز مارٹن کے سوال کی آڑ لے کر باقاعدہ جیسے اسے سمجھا رہا تھا کہ وہ

اس سے فری ہونے کی کوشش نہ کرے۔

مگر وہ کب فری ہونے کی کوشش کر رہی تھی؟

سوائے اس کے سوال کے جواب کے اس نے تو اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔

اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا۔۔۔ پھر چپ ہو گئی۔ جانے کیا جواب دیتا؟ اتنے

سارے اجنبی مہمان تھے۔ یورپ کے ہر کونے سے۔ شاید اور بھی کئی ممالک

سے۔ ایسے میں دو پاکستانی آپس میں لڑ پڑتے۔ کیا سوچتے سب؟

اور پھر۔ کیا وہ اس چٹان سے نکلے سکتی تھی؟
اسے اپنا آپ اچانک بے بس سا۔ تنہا تنہا محسوس ہوا۔
کھانے سے ہاتھ روک کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
جان عالم نے چونک کر اسے دیکھا۔
اس کی نظروں میں پچھتاوا تھا؟ جذبہ تسکین تھا؟ یہ دیکھنے کی اس نے ضرورت
نہیں سمجھی۔

”ایکسکیوز می۔“ اس نے انگریز جوڑے سے معذرت کی۔
”چلیے اوپر ڈیک پر جاتے ہیں۔“ وہ پاس ہی بیٹھے مجتبیٰ اور آنٹی سے مخاطب
ہوئی۔

”چلو ڈیر۔“ آنٹی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔
جان عالم نے ایک نظر مجتبیٰ اور آنٹی پر ڈالی۔
چند ٹاپے ان تینوں کو سیڑھیوں کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ اور پھر خاموشی
سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔
ڈیک پر کئی پسینہ خیز پہلے سے موجود تھے۔ اور بھی آہستہ آہستہ اوپر آرہے
تھے۔

صبح شپ پر پہنچ کر وہ کتنی خوش تھی۔ دو ہفتے دریا کی سیر۔ بیسیوں مسافروں
کے ہمراہ۔ دریائے رائین میں۔ جس کا ذکر اس نے صرف کتابوں میں پڑھا
تھا۔

مگر۔۔۔ وہ سمجھ کر رہ گئی۔ پورے دو ہفتے وہ اس آدمی کو دیکھے گی۔ برداشت
کرے گی۔ کیونکر؟

اور پھر۔ اس نے سوچا۔۔۔ یہ اس کے باپ کا جہاز نہیں تھا۔ یہاں سب
برابر تھے۔ سب نے ایک جیسی رقم ادا کی تھی۔ اور سب نے ایک جیسے رہنا تھا۔
آئندہ وہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔

یہ فیصلہ کرتے ہی۔ اسے اچانک ہر چیز دوبارہ خوبصورت نظر آنے لگی۔
سورج غروب ہوا چاہتا تھا پانی کی لہریں، سفید چمکتا دمکتا شپ، پنجرہ تک
سنہری رنگ میں رنگے نظر آ رہے تھے۔

رینگ کا سہارا لئے پانیوں پر نظریں جمائے وہ کھڑی تھی۔ بارج اور کشتیاں
اپنے کام کے سلسلے میں تیزی سے آ جا رہے تھے۔ فیریاں آتے جاتے بندرگاہ کو
کر اس کر رہی تھیں۔ اور۔۔ انہی کے درمیان بڑے بڑے شپ بھی نظر آ رہے
تھے۔

کئی مسافر ڈونبے سورج کا نظارا اور ایسٹریڈیم ہاربر کی تصویریں کیسروں
میں محفوظ کر رہے تھے۔ کچھ دور بین لئے پانی میں آنے والے بھاری بھر کم
جہازوں پر لکھی ان کی شناخت پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔
ملگجا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔

”تم تو گم ہو گئی ہو کیا بات ہے؟“ مجتبیٰ نے اس کی آنکھوں کے آگے اگلیاں
نچائیں۔

”اوہ۔۔ واقعی، دیکھیں تاہر چیز کتنی نئی کتنی خوبصورت ہے۔“ وہ قریب ہی
رینگ کے ساتھ لگی بیچ پر بیٹھ گئی۔

”وہ تو ہے۔ مگر تم اتنی بھی گم نہ ہو کہ ڈھونڈنا پڑ جائے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی۔ مجتبیٰ اکثر بڑی ذومعنی بات کہہ جاتا۔ کبھی
ہیر پھیر کر کبھی براہ راست۔

اُس کی اور بھی کئی گرل فرینڈز تھیں۔ سیریس شاید وہ کسی ایک کے ساتھ بھی
نہیں تھا۔ یورپ میں فیشن تھا غالباً یہ سب۔

شام کے بڑھتے سائے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ ڈیک پر کے
مسافروں کو، فضا کو، وسیع پانیوں کو۔

بندرگاہ کے ساتھ ساتھ ریور ٹریفک میں بھی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ بارجز

اور بٹس کی روشنیاں پانی میں تھرکتی ان کے شب کی روشنیوں سے ٹکراتی گزر رہی تھیں۔

ہوا خشک ہو رہی تھی سردی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی۔

”بیٹا میں تو نیچے کیبن میں جا رہی ہوں۔ سردی سے ٹانگ میں درد ہونے لگا ہے۔“ بھاری سے جسم والی آنٹی شفقت سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں بھی چلتی ہوں آنٹی۔“ ناجیہ بھی اٹھی۔

”نہیں بیٹا تم دونوں رہو۔ Enjoy کرو۔ وہ چل دیں۔

”دیکھا ماما بھی کہہ رہی ہیں Enjoy کرو۔“ مجتبیٰ جلدی سے بولا۔

پتہ نہیں کیوں؟ مجتبیٰ کی باتیں اُسے پریشان کر رہی تھیں۔

”کافی Enjoy کر لیا ہے۔“ اُس کی معنی اُن سنی کرتے ہوئے اس نے

کہا۔ چلئے اب کیبن میں جاتے ہیں۔“

”نہیں تھوڑی دیر اور۔ کتنا سکون ہے یہاں۔“

وہ رک گئی۔ ریٹنگ پر سے جھکتے ہوئے وہ پانی میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ مجتبیٰ

قریب ہی بیچ کی پشت سے سرٹکائے بیٹھا تھا۔ کبھی کبھار ایک آدھ ذومنی جملہ کہہ

جاتا جسے ناجیہ یوں ٹال دیتی جیسے اُس کا مطلب سمجھ ہی نہ پارہی تھی۔

معاذہ چوکی کوئی پاس ہی آ کر کھڑا ہوا تھا۔

مڑ کر اس نے دیکھا۔

جان عالم تھا۔ بے خبر سا کھڑا سامنے سیاہ پانیوں پر نظریں جمائے تھا۔

ایک ہل کو اس کا دل دھڑکا ضرور۔ مگر پھر۔۔۔ وہ دوبارہ ریٹنگ پر جھک

آئی۔

”تمہارے بال اتنے لمبے کیوں ہیں؟“ مجتبیٰ نے اس کی ڈھیلی سی چوٹی اپنے

ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے کہا۔

گھبرا کر ناجیہ نے جان عالم کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ سن تو نہیں رہا تھا؟

وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔ چند ثانیے وہ کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا نیچے لاؤنج میں اترتی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔
 ”چلے نیچے چلتے ہیں۔ سردی بھی بہت ہو گئی ہے۔“ ناجیہ اپنے بال چھڑاتے ہوئے بولی۔

مجتبیٰ اٹھ کھڑا ہوا۔

”نیچے لاؤنج میں بیٹھیں گے تم اتنی جلدی نہیں سوؤ گی مجھے معلوم ہے۔“
 وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے لاؤنج میں آ گئے۔

اور بھی کئی لوگ تھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ کچھ کپ شپ کر رہے تھے۔
 ”تم وہاں بیٹھو“ میں کولڈ ڈرنکس لے کر آتا ہوں۔“ مجتبیٰ نے کھڑکیوں کے پاس لگی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

بیٹھنے سے پہلے وہ بائیں جانب لائبریری کے فیلٹوں میں لگی کتابوں کا جائزہ لینے لگی۔ اکثر کتابیں، میگزین ڈچ، جرمن اور فرنچ زبان میں تھیں۔ کچھ انگلش میں بھی تھیں۔

وہ ایک انگلش میگزین اٹھا کر مجتبیٰ کی بتائی ہوئی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔
 تھوڑی ہی دیر میں مجتبیٰ بھی ڈرنکس لے کر آ گیا۔

میگزین پر نظریں جمائے وہ وقفے وقفے سے گلاس سے گھونٹ لے رہی تھی اور وقفے وقفے سے ہی مجتبیٰ بھی ایک آدھ ذومعنی بات کہہ جاتا۔
 ہاتھ بڑھا کر ناجیہ نے خالی گلاس میز پر رکھا۔

”دکھاؤ دکھاؤ“۔ اچانک مجتبیٰ نے اس کا وہی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
 ”تمہارے ہاتھ کی لکیریں تو...“

اور ناجیہ کی نظریں غیر ارادی طور پر سامنے اٹھ گئیں۔

جانبِ عالم بار میں کاؤنٹر کے آگے سنول پر بیٹھا وہسکی کا گلاس ہاتھ میں لئے ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

خفیف متبسم لبوں پر طنز تھا۔ سٹون گرے آنکھوں میں تضحیک۔
وہ کانپ کر رہ گئی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اس نے اوپر ڈیک پر مجتبیٰ کو اس کی
چوٹی ہاتھ پر لپیٹتے اور اس کے بالوں سے متعلق بات کرتے سنا تھا۔ اور
اب۔۔ اس وقت!

وہ تو ویسے بھی اسے اچھا نہ سمجھتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟ اور اب۔۔ اب تو
جانے کیا کچھ سوچا ہو گا اس کے بارے میں؟
ہاتھ چھڑاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

مجتبیٰ سے کچھ بھی کہے بنا۔ تیز تیز چلتی نیچے آگئی۔ تھوڑی دیر آنٹی کے پاس
بیٹھی ان کی ٹانگ پر مالش کرتی رہی۔ پھر انہیں کبل اوڑھا کر 'شب بخیر' کہتے
ہوئے اپنے کیمین میں آگئی۔

رات کے کپڑے تبدیل کر کے وہ کھڑکی تک گئی۔

ایسٹر ڈیم ہار برانڈ ہیرے میں اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔

دور عمارات کی روشنیاں جھلکا رہی تھیں۔ سڑک پر آتی جاتی کاروں اور
بسوں کی لائٹس نظر آ رہی تھیں اور۔۔ پاس ہی ریور ٹریفک کی بتیاں نظر آ رہی
تھیں اور۔۔ پاس پانی کی سطح پر ناچتی تھرکتی رواں دواں تھیں۔

اس نے کھڑکی بند کر دی۔ ایک اچھتی نظر کھڑکی سے لگی میز پر ڈالی۔
خوبصورت گلدان میں موسم کے تازہ اور مہکتے پھول لگے تھے۔ ایک طرف چھوٹا
ساپا راسائیل کیلنڈر رکھا تھا۔ پاس ہی ایک قیمتی سفید رنگ کا رایننگ پیڈ، درجن
بھرسفید ہی لفافے، ساتھ ہی اسی رنگ کا قلم پڑا تھا۔

اس نے پیڈ کا صفحہ پلٹا۔ شینگ لائین کے نام کے ساتھ ہی نیلے پانیوں پر
رواں دواں ایک ننھی سی دو بادبانوں والی کشتی بنی تھی۔ یہی نام اور یہی کشتی
لفافوں کی پچھلی طرف اور قلم پر بھی کندہ تھی۔

اسے امی کا خیال آ گیا۔ وہ انہیں خط لکھے گی۔ مگر چند روز بعد۔ ابھی تو سفر

شروع بھی نہیں ہوا تھا۔

تھکی تھکی سی وہ پلٹی۔ جتنی بچھائی۔ اور بستر پر دراز ہو گئی۔

تبھی اسے احساس ہوا۔

جسمانی تھکاوٹ سے زیادہ وہ ذہنی طور پر تھک چکی تھی۔

اس کی نظروں میں جان عالم اور اس سے کئی بار بڑھ بھڑ گھوم گئے۔

وہ ایسا کیوں تھا؟ اتنا تلخ اتنا بیزار۔

لیکن نہیں۔ وہ مسٹر اور مسز مارٹن کے ساتھ تو ایسا نہیں تھا۔ ان کے ساتھ تو

وہ بہت مستقل مزاج، بہت دھیمہ تھا۔

بہر حال۔ اس نے کروٹ بدلی۔

آنکھیں بند کیں۔ سونے کی کوشش کی۔

مگر۔ کچھ تو باہر شور تھا۔

پانی کی لہریں شپ سے مسلسل ٹکرا رہی تھیں۔ کبھی کوئی بارج قریب سے چھک

چھک کرتا گزرتا۔ تو کبھی باہر سڑک پر کسی گاڑی کی 'ڈور' کرتی آواز چونکا دیتی۔

اور پھر کچھ۔ اُس کے قریبی کیمین میں بار بار کوئی کروٹیں بدل رہا تھا۔

وہ انہی۔ قہر مس سے پانی پیا۔ اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔

آنکھیں موند لیں اور کروٹ دیوار کی طرف لے لی۔

کچھ کچھ غنودگی نے آلیا۔

مگر۔ پھر وہی۔ پاس والے کیمین میں کسی نے کروٹ بدلی۔

اور اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

ڈھائی تین بجے تک یہی ہوتا رہا۔ اور پھر اسے یاد نہیں رہا۔ شاید وہ سو گئی

تھی۔

ابھی ٹھیک سے روشنی بھی نہیں ہوئی تھی کہ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔
 شپ کے انجنوں کے ارتعاش کا زبردست شور ہوا تھا۔ اور پھر چند منٹ میں
 صاف محسوس ہونے لگا۔ شپ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا تھا۔
 آخر ان کا سفر شروع ہو ہی گیا تھا۔

اٹھ کر اس نے کھڑکی کھولی۔ باہر دیکھا۔ نہر کے کناروں کی سرسبز گھاس نظر
 آنے لگی تھی۔

وہ لوگ آہستہ آہستہ ریور رائین کی طرف بڑھنے لگے تھے۔
 اس نے جلدی جلدی وضو کیا، نماز پڑھی۔ فارغ ہو کر گلابی پھولدار سوٹ
 ہمرنگ دوپٹہ اور گلابی ہی شوز پہنے۔

تیار ہو کر آنٹی کی طرف جانے کا سوچ ہی رہی تھی۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کھول کر دیکھا۔

ویٹر لیس تھی۔ مورنگ ٹی سرو کر رہی تھی۔

چائے کا شوق نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے چائے لے لی۔ اور کھلی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

صبح کی نرم و لطیف ہوا روح کو سرور بخش رہی تھی۔ اور تاحد نظر پھیلے سرسبز و شاداب کھیت خود اپنی زبان سے کہہ رہے تھے۔ یہ ہالینڈ ہے۔

چائے ختم کر کے وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ خالی پیالی میز پر رکھی۔ اور باہر نکل کر کیمین لاک کرتے ہوئے آنٹی کی طرف چل دی۔
”صبح بخیر آنٹی۔“

”صبح بخیر بیٹا۔“ وہ بستر میں تھیں۔ بیڈ ٹی پی رہی تھیں۔

”بیٹھو۔“ وہ ان کے بستر کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ ”رات کیسے گزری؟“
”ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔“

”اتنے زور سے شپ سارٹ ہوا کہ میں تو گھبرا ہی گئی۔“ آنٹی نے کہا۔
”میری بھی اسی وجہ سے آنکھ کھل گئی۔“

”میرا تو خیال ہے سارے پنجر ز اس شور سے جاگ گئے ہوں گے۔“
انہوں نے خالی کپ آگے بڑھایا۔

ناجیہ نے کپ لے کر میز پر رکھ دیا۔

”شکریہ بیٹے۔ اب اٹھوں ذرا کپڑے بدل لوں۔“ مجتبیٰ تو کبھی کا اوپر ڈیک پر گیا ہوا ہے۔“

آنٹی تیار ہوئیں۔ تو وہ دونوں بھی اوپر ڈیک پر آ گئیں۔

چند منٹ صبح کے پاکیزہ ماحول میں اطراف کو دیکھتے رہنے کے بعد مجتبیٰ کو ساتھ لئے وہ ناشتے کے لئے نیچے لاؤنج میں آ گئیں۔

مسٹر اور مسز مارٹن اس سے پہلے ہی میز پر پہنچ چکے تھے۔
 ”گڈ مورننگ“۔ آہستہ سے کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔
 ”گڈ مورننگ“۔ دونوں میاں بیوی مسکرا کر بولے۔

اور پھر۔ وہ دونوں ناجیہ سے رات اور پھر منہ اند میرے شب کے چل پڑنے کی باتیں کرنے لگے۔

ناشتہ لگ چکا تھا۔ جوس پی لینے کے بعد وہ ٹوسٹ پر کھن لگا رہی تھی۔
 ”گڈ مورننگ مسٹر عالم“۔ مسٹر مارٹن کی آواز پر چونک کر اس نے سر اٹھایا۔
 وہ آچکا تھا۔ کرسی کی پشت تھاے کھڑا تھا۔ دبیز قالین پر اس کے قدموں کی آہٹ محسوس ہی نہیں ہوئی تھی۔
 ”مورننگ“۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ دلنیش گرے اش آنکھوں میں سرخ ڈورے بہت واضح تھے۔ پرکشش چہرہ مضحل سا تھا۔
 سر جھکا کر وہ دوبارہ مصروف ہو گئی۔

اسے میز پر دیکھتے ہی ویٹریس بھاگی بھاگی آئی۔ جیسے اس کی ہی منتظر تھی۔
 مستعدی سے اسکے آگے ناشتہ لگانے لگی۔

وہ چپ چاپ تھا۔ اس وقت کل والی تلخی یا تندی بھی نہ تھی آنکھوں یا چہرے پر۔
 جوس کا گلاس اٹھا کر اس نے منہ سے لگا لیا۔

دو چار بڑے بڑے گھونٹ لے کر خالی گلاس دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ جیسے جوس نہیں کوئی دوا ہو۔ جیسے مرضی سے نہیں زبردستی پی رہا ہو۔

”رات آپ ٹھیک سے سوئی نہیں مس احمد۔“ چھری سے ٹوسٹ کاٹتے ہوئے وہ اچانک کہنے لگا۔

وہ سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اُسے کیسے معلوم ہوا کہ وہ سوئی نہیں۔
 وہ کچھ نہیں بولی۔ اس میں اتواتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ پوچھ لیتی۔ اسے کیونکر

معلوم ہوا۔

پتہ نہیں کیا بات تھی اس آدمی میں۔ وہ تو سارا حوصلہ ہی کھو بیٹھتی اُسے دیکھ کر۔

کہاں کہ وہ اتنی پڑ اعتماد تھی۔ اس کی پڑھائی کا ریکارڈ بچپن سے بہترین تھا۔ اس کی خوبصورتی کی کالج میں مثالیں دی جاتی تھیں۔ اس کی عادات و اطوار کو اس کی خاندانی شرافت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

مگر۔۔۔ یہاں۔۔۔ یہ آدمی۔۔۔

اس کی عمر ستائیس، اٹھائیس سے اوپر ہرگز نہیں تھی۔ مگر بدبہ؟ خود وہ بھی انیس سال کی ہونے والی تھی۔۔۔ پر۔۔۔ اس کو دیکھ کر گھبرا کیوں جاتی تھی؟

“You don't seem to be feeling well.”

مسٹر مارٹن جان عالم کو تشویش سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

“Only I couldn't sleep last night.”

سرخ بھاری آنکھیں اٹھا کر اس نے ناجیہ کو دیکھا۔
گھبرا کر وہ پلکیں جھپکنے لگی۔

“We saw you at the bar late in the night.”

مسٹر مارٹن بولے۔

ناجیہ کو یاد آیا۔ رات وہ کاؤنٹر پر بیٹھا پی رہا تھا۔

“It is not always so.”

اُس کی آواز ست اور بھاری تھی۔

چائے پی کر وہ معذرت کرتے ہوئے اُٹھ آئی۔

وہ زیادہ دیر اس آدمی کا سامنا نہیں کر پار ہی تھی۔

“آئی میں اوپر ڈیک پر جا رہی ہوں۔” دو قدم چل کر وہ آئی کے پاس

آگئی۔

”ہاں ڈیز تم چلو۔ ہم آتے ہیں۔“

اور وہ — بچے تلے قدم اٹھاتی لاؤنج کراس کرنے لگی۔

سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی اس کی نظر دائیں طرف نوٹس بورڈ پر پڑی۔
پنجر لسٹ لگ چکی تھی۔

وہ نیچے سے اوپر نظریں دوڑانے لگی۔

... کیبن نمبر ۸۶ ... کیبن نمبر ۷۶ ... کیبن نمبر ۵۰ ...

کیبن نمبر ۳۰ ... کیبن نمبر ۲۶ مسز سعیدہ مصطفیٰ کیبن نمبر ۱۲

کیبن نمبر ۱۰ ... کیبن نمبر ۲ مس ناجیہ احمد ... کیبن نمبر اسٹریجان عالم
اور — اُسے چکر سا آگیا۔

”رات آپ ٹھیک سے سوئی نہیں مس احمد“۔ وہ بولا تھا۔

اس کا مطلب تھا اب اپنے کیبن میں بھی اسے دم سادھ کر رہنا تھا۔
پورے دو ہفتے!

غیر ارادی طور پر مڑ کر اُس نے میز کی طرف دیکھا۔

چائے کا کپ ہاتھ میں لئے وہ اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اُس نے جلدی سے رخ واپس موڑ لیا۔

تیز قدم۔ اور تیز تیز ہی دھڑکتا دل لئے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اوپر کا ماحول کتنا سہرا تھا۔ کتنا دلآویز۔ نیچے لاؤنج میں ناشتے کی میز پر جو

گھٹن دل کو جھکڑے تھے۔ آہستہ آہستہ دور ہونے لگی۔

سامنے کھیتوں میں گائیں چر رہی تھیں۔ سبزہ تھا ہریالی تھی۔ تاحد نظر سفیدے

کے قد آور درخت تھے۔ جگہ جگہ سڑکوں اور نہروں پر بنے پل تھے۔

اُس نے اوپر نگاہ کی — لامحدود وسعتوں پر پھیلا آسمان صاف تھا۔ دور اُس

بار — ایک دو بادلوں کے ٹکڑے ابھر آئے تھے۔

اُس نے لمبی گہری سانس لی۔ جیسے ماحول کی اس پاکیزگی۔ فضا کی اس تراوٹ کو اپنے وجود میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔

”ناجیہ ڈارلنگ“۔ آخری سیڑھی چڑھتے ہی مجبئی نے ہانک لگائی تھی۔ چونک کر وہ مڑی۔ آہستہ سے مسکرا دی۔

مجبئی جیسا بھی تھا۔ برا آدمی نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ طریقے سے اُسے سمجھا دے گی۔ کہ اس کے ماحول میں اور ناجیہ کے ماحول میں بڑا فرق تھا۔ لڑکے اور لڑکی کی فرینڈشپ کو اسکے یہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

”آئی نہیں آئیں“۔ وہ رینگ کے قریب بچ پر بیٹھ گئی۔

”فکر نہیں کرو آجائیں گی مجھے تمہارے پاس اکیلا کہاں چھوڑتی ہیں“۔ وہ ہنستے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

معا ناجیہ کی نظریں کپڑوں کو ارٹرز کی طرف اٹھیں۔

جان عالم باہر نکل کر مختصر سی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر محتاط سی ہو گئی۔ رخ مجبئی کی طرف کرتے ہوئے توجہ اس پر لگا دی۔

”وہ بارج دیکھو“۔ مجبئی نے پانی میں آتی ایک بوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”گھر کا گھر چلا آ رہا ہے“۔

ناجیہ نے دیکھا۔ واقعی کمروں میں پردے لگے ہوئے تھے۔ گملوں میں پودے سجے تھے۔ آس پاس بچے بے دھڑک کھیل رہے تھے۔ جیسے پانی ہی ان کا گھر ہو۔

”تمہاری شکل کس پر مگنی ہے؟“۔ مجبئی اچانک پھر مڑی سے اتر گیا۔ اسے

توصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میری امی پر“۔

”شکر ہے انکل پر نہیں مگنی“۔ وہ رازدارانہ اس کے کان کے پاس منہ لے جا

کر اس کے ابو کی سادہ سی شکل پر لطیف چوٹ کر گیا۔
 اس کے لب و لہجہ پر وہ بے اختیار ہنس دی۔
 اور ہستے ہستے ہی اس کی نظر تین چار قدم پر ریلنگ کے قریب رکھی فولڈنگ
 چیئر پر پڑی۔

جان عالم تھا۔ ٹانگیں سامنے سیدھی پھیلائے سرکری کی پشت سے ٹکائے
 نیم دراز۔ اسی سمت دیکھ رہا تھا۔

وہ سرخ سی ہو گئی۔ رخ واپس مجتبیٰ کی طرف کر لیا۔
 اس کی نظروں میں عجیب سی چھن ہوتی تھی۔ لبوں پر انوکھا سا طنز ہوتا
 تھا۔ اس کے لئے۔ ہاں صرف اس کے لئے۔ اب تک وہ بخوبی جان گئی
 تھی۔

”اور شکر ہے میری شکل میری ماما پر نہیں گئی۔“ مجتبیٰ میٹر حیاں چڑھ کر ڈیک پر
 آتی آنٹی کو دیکھتے ہوئے ہنس کر پھر بولا۔

”کیا چیز ہیں آپ۔“ ناجیہ بولے بنا نہ رہ سکی۔ وہ تو کسی کو بھی معاف نہیں
 کرتا تھا۔ ”آنٹی تو بہت سویٹ ہیں۔“

”میں نے کب کہا کڑوی ہیں۔ بس ذرا۔ آپس کی بات ہے۔
 خوبصورت بالکل نہیں ہیں۔ پتہ نہیں پاپا کو کیا نظر آیا تھا۔“
 ”واقعی آپ کی شکل انکل پر گئی ہے“ ناجیہ نے کہا۔

واقعی بالکل۔ کہیں سے بھی نہ لگتا تھا کہ اس میں کسی اور قوم کا بھی خون
 شامل ہے۔ نہ رنگ، نہ نقش، نہ بال۔ سبھی تو انکل جیسے تھے۔

”پھر تو میں تمہیں ضرور اچھا لگتا ہوں گا۔“ پُر امید ہونے کے ساتھ ساتھ وہ
 حسب عادت ہنس بھی رہا تھا۔

”بہت اچھے لگتے ہیں۔ بالکل بھائی کی طرح۔“

اور مجتبیٰ نے زور سے اس کی چوٹی سمجھ لی۔

”نیچے پانی میں پھینک دوں گا۔“ وہ زور سے بولا۔
 تاجیہ نے جلدی سے اپنی چوٹی واپس کھینچ لی۔ نظریں گھبرا کر ایک بار پھر
 جان عالم پر پڑیں۔

وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا۔ نظریں خالی خالی۔
 مگر۔۔۔ وہ یہ سب دیکھ ضرور رہا تھا۔

یہاں چاہے معاملہ بالکل سیدھا سا داتا تھا۔ مگر اس نے ضرور کوئی نہ کوئی نتیجہ
 اخذ کیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دل کہتا تھا۔

”بیاد مسٹر عالم“۔ ایک اچھی پیاری سی لڑکی جینز اور سیلر لیس ٹاپ پہنے
 جان عالم کے پاس آتے ہوئے بولی۔

اس کا لباس یورپین تھا۔ مگر وضع قطع سے وہ مشرقی لگ رہی تھی۔ شاید ایرانی
 تھی۔

”ہیلو“۔ لڑکی کا آگے بڑھا ہاتھ تھام کر شائستگی سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہو۔
 اس کی ساری تلخی صرف تاجیہ کے لئے تھی۔ بار بار اسے ماننا پڑ جاتا تھا۔

یہاں اس لڑکی کے ساتھ تو۔۔۔ وہ مجسم اخلاق تھا۔
 اس کے پرکشش نقوش میں اچانک نرمی آگئی تھی۔ ہنوز بھاری آنکھیں
 مسکرانے لگی تھیں۔

گوکہ۔۔۔ انداز وہی مخصوص جاکمانہ تھا، فرمانرواؤں والا۔ نظروں میں وہی
 اختیار تھا حکمرانوں جیسا۔

اپنی سیٹ اس نے لڑکی کو دے دی۔ خود اس کے مقابل رینگ سے لگی بچ پر
 بیٹھ گیا۔

تاجیہ نے رخ واپس پھیر لیا۔ آنٹی بھی آگئی تھیں۔ تینوں اطراف پر نظریں
 جمائے باتوں میں مصروف ہو گئے۔

آنٹی شفقت سے بول رہی تھیں۔ مجتبیٰ بات بات پر ہنسا رہا تھا۔

مگر جانے کیوں؟ ناجیہ چپ چپ سی نظر آنے لگی تھی۔ اداس اداس سی۔
 ”... ریور رائین چھ یورپین ممالک کو آپس میں ملاتا ہے اور اسی طرح انہیں
 سمندر کے ساتھ بھی۔ دنیا کے تمام دریاؤں سے زیادہ ٹریفک چلتی ہے اس
 میں...”

جان عالم لڑکی کو ریور رائین سے متعلق کبھی فارسی اور کبھی انگریزی میں
 معلومات بہم پہنچا رہا تھا۔

بہت دھیمے انداز میں — بڑے دلکش پیرائے میں۔

کئی دلچسپ باتیں — جو معلومات سے پر تھیں۔

کوئی پینے کا ٹائم ہو رہا تھا۔

وہ تینوں نیچے لاؤنج میں آ گئے۔

آئی کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھ گئیں۔

مجتبیٰ کوئی لینے کاؤنٹر پر گیا اور ناجیہ چند قدم چلتی لاہریری سیکشن میں مختلف
 کتابوں پر نظریں دوڑانے لگی۔

اوپر کی ہیلف میں انگلش کلاسیکس موجود تھے۔ شیکسپیر کے ڈراموں کا مکمل

سیٹ تھا۔ کئی اور ناول تھے۔ اُس نے Hardy کا 'A Pair of Blue Eyes' نکال لیا۔

آئی اور مجتبیٰ کوئی پی رہے تھے۔ اور وہ — جلد ہی کتاب کے موضوع میں
 جذب ہو گئی۔

”سب ست ہیں“۔ مجتبیٰ کوئی کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اور یہ

شپ دونوں — پڑھنے کو کیا ہارڈی ہی رہ گیا تھا — اور یہ شپ — کیا مستانی
 چال ہے۔ آگے جیسے بڑھ ہی نہیں رہا“۔

”ہمارا بھی تفریح کا ٹرپ ہے کون سا کہیں ضروری پہنچنا ہے ہمیں“۔ آئی

بولیں۔ ”اور ناجیہ — میں تو کہتی ہوں اس کا ذوق تم سے کہیں اچھا ہے“۔ آئی

جہاں ناجیہ کی سائیڈ لے رہی تھیں وہاں محبتی کو بھی چڑا رہی تھیں۔
 ”ماما میں تو جا رہا ہوں اوپر چند تصویریں لوں گا۔“ وہ ناجیہ کے سر کو ہلکے سے
 جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”آپ اور ناجیہ لطف لیں تفریحی ٹرپ کا۔“
 وہ دونوں وہیں بیٹھی رہیں۔ آنٹی نے بھی قریب رکھا اخبار اٹھا لیا تھا۔ پھر
 دونوں مطالعے میں اس قدر محو ہو گئیں کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

دوپہر کو وہ لنچ پر نہیں آیا تھا۔ اس کی سیٹ خالی تھی۔ لنچ کے بعد آنٹی اپنے
 کیمین میں آرام کرنے گئیں تو ناجیہ بھی اپنے کیمین کی طرف آنے لگی۔
 یونیفارم میں ملبوس سیوورڈ لیس کھانے کی ٹرے لئے کیمین نمبر 1 پر کھڑی تھی۔
 دروازہ کھلا۔ اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

ناجیہ بھی اپنا کمرہ کھول کر اندر آ گئی۔ تھکی تھکی تھی۔ بستر پر اوندھی پڑ گئی۔
 پاس والے کیمین میں کراکری اور کٹلری کا شور تھا۔ آج وہ اپنے کیمین میں لنچ
 کر رہا تھا۔ شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جیسا کہ صبح سے وہ لگ رہا تھا۔
 یا پھر۔۔۔ وہ ذرا زیادہ ہی خاص پسینہ تھا۔ جس کی اس کے کیمین میں ہی تواضع
 ہو رہی تھی۔

وہ۔۔۔ سو گئی تھی شاید۔ اٹھی۔۔۔ تو شام کے ساڑھے چار ہو رہے تھے۔
 اس نے منہ دھویا۔ بالوں پر برش کر کے ڈھیلی سی چوٹی بنائی۔ اور۔۔۔ کیمین
 سے نکل کر آنٹی کی طرف چل دی۔

دور۔۔۔ کوریڈور کے آخری سرے پر۔ اس نے دیکھا آنٹی اور ان کی یہیں
 شب پر بنی ساٹھ پینسٹھ سالہ انگریز دوست مسز براؤن دروازہ کھول کر اُس پار چلی
 گئی تھیں۔

تیز تیز چلتی وہ بھی اسی طرف بڑھی۔
 بڑا ساشیشہ لگے Swing door کو دھکیلا۔

اور۔۔۔ ساتھ ہی۔۔۔ جیسے سارا خون نچوڑ لیا کسی نے۔
 دروازہ جھول کر جا لگا تھا مخالف سمت سے آنے والے جان عالم کے سر میں!
 وہ وہیں دیوار سے لگی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔
 شیشے میں سے اس نے دیکھا۔

چند ثانیوں کو وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔ جیسے اس اچانک وار کے لئے تیار نہ تھا
 پھر۔۔۔ وہ آگے بڑھا اور۔۔۔ دروازہ دھکیل کر کوریڈور میں آ گیا۔
 وہ بالکل نارمل تھا۔ یہ دیکھ کر ناجیہ کی جان میں جان آ گئی۔
 دفعتاً۔۔۔ اس کی نظر ناجیہ پر پڑی۔
 یکدم ہی اتھارٹی بھری آنکھوں میں وحشت چھا گئی۔
 کمانڈر تا سرا پا آگ بگولہ ہو گیا۔

”آپ کو معلوم ہے Swing door میں شیشہ کیوں لگا ہوتا ہے؟“
 مطلق العنان فرمانروا اپنی رعایا کی حقیر ترین مخلوق کو گھور رہا تھا۔
 اُس کی سہمی آنکھیں پھیل گئیں۔ دیوار تھا سے وہ ایک قدم پیچھے سرک گئی۔
 ”ہہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ تاکہ مخالف سمت سے آنے والا نظر آ سکے۔“ اُس نے کہا
 چاہا۔ مگر آواز حلق میں ہی پھنس گئی۔

پھیلی پھیلی، غم سی آنکھیں لئے وہ اسے دیکھتی رہی۔ اور بس!
 دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی وحشت کم ہونے لگی۔
 آگ بگولہ سرا پے پر اوس سی پڑنے لگی۔
 ناجیہ نے پلکیں جھپکیں۔

وحشت کی جگہ اب کرب نے لے لی تھی۔
 لپکتے شعلوں کی جگہ نرمی نے لے لی تھی۔
 بھنگی پلکیں لئے۔۔۔ وہ واپس پلٹ آئی۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ڈیک پر آئی اور ریٹنگ کے پاس بیٹج پر ڈھیر ہو گئی۔

نہر چھوڑ کر شپ دریائے رائن میں داخل ہونے لگا تھا آگے کئی Locks تھے جن میں سے شپ کو گزر کر نہر سے دریا میں جانا تھا۔ سب لوگ ریلنگوں کے پاس اکٹھے ہو گئے تھے۔ دیو قامت جہاز کو بڑے بڑے پھانکوں میں سے گزرتا دیکھنے کے لئے۔

تمام ریور کرافٹ جمع ہو گئی تھی۔ آگے بڑے بڑے گیٹ بند تھے۔ Lock کے اندر کے پانی کے لیول کو نیچے کیا جا رہا تھا۔ اتنا کہ باہر جمع تمام ریور کرافٹ کو اندر آنے دے سکے۔ کافی مبر آزا مرحلہ تھا۔ پھر گیٹ کھول دیئے گئے۔ بعد شپ کے تمام کشتیاں بار جزا اندر داخل ہوئے۔ گیٹ دوبارہ بند ہوئے۔ پانی کا لیول آہستہ آہستہ اونچا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آگے کے پانی کے برابر ہو گیا۔ اور یہ لوگ آگے چل پڑے۔

پھر۔ اگلا ٹاک آیا۔ اور اسی طرح یہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔

اس دوران مجتبیٰ نے کئی تصویریں لیں۔

شام تک وہ لوگ Arnhem پہنچ گئے۔

جہاز نے لنگر ڈال دیئے۔ شپ پر سوار ہونے کے بعد یہ پہلا اسٹیشن تھا جہاں وہ لوگ رُکے تھے اور جہاں باہر نکل کر گھوم پھر سکتے تھے۔

سیڑھیاں اُتر کر وہ نیچے کیبن میں آ گئی۔ اور ضروری چیزیں لے کر ہاتھ روم چل دی۔

نہا کر طبیعت خاصی ہلکی محسوس ہونے لگی۔

ڈارک بلو قمیض شلوار، ہمرنگ دوپٹہ اور تازک ڈوری کی خوبصورت جوتی پہن کر۔ اس نے اپنے بے تحاشہ گھنے اور لمبے بالوں کو بمشکل سلجھایا۔ خشک ہونے کے لئے کھلا چھوڑا۔ اور کپڑوں پر اپنی پسندیدہ کلون کی سپرے کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

بچے تلے قدم اٹھاتی وہ ادھر پر پشپن ڈیسک کی طرف بڑھی۔

کل کچھ کارڈز دیکھے تھے وہاں سوچا امی کو بھیجے گی۔

کارڈز پر نظریں دوڑاتے دوڑاتے وہ چونکی۔

جان عالم تھار سپشن آفس میں۔ کوئی رجسٹر کھولے جیسے جانچ پڑتال کر رہا تھا۔

وہ پریشان سی ہو گئی۔ ہر جگہ موجود رہتا تھا۔ ہر کام میں کام رکھتا تھا۔

وہ بھی پوری شان سے — بھرپور اختیار سے۔

شب بھی جیسے اپنی ملکیت ہو اس کی۔ اس کا عملہ جیسے اسی کے کنٹرول میں ہو۔

اسے غصہ آ گیا۔ سارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ اس

نے رجسٹر بند کر دیا۔ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

وہ بدحواس سی کھڑی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

اس کی نظریں انھیں — تاجیہ پر پڑیں۔

پہلی نظر جیسے نادانستگی میں اٹھی تھی۔

دوبارہ دیکھا — نیچے سے لے کر اوپر تک۔

ڈارک بلوشلوار۔ قمیض۔ ڈارک بلو ہی دوپٹہ۔ گھٹنوں سے آگے نکلتے لمبے

اور کیلے بال۔

پرکشش نقوش آہستہ آہستہ سیاہیوں کی زد میں آ رہے تھے۔

خوبصورت گرے اش آنکھوں میں حقارت اتر رہی تھی۔

کیا ہو جاتا تھا اسے؟

نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر وہ سہم گئی۔

نظریں جھکاتے ہوئے واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔

”کوئی کام تھا یہاں؟“

اس کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔ وہی اتھارٹی، وہی کماٹ۔

وہ آگے بڑھ ہی نہ سکی۔

رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔

سیاہیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔ حقارت معدوم ہو رہی تھی۔
 جیسے ایک دورہ سا پڑ جاتا تھا اسے اس کو دیکھ کر اور پھر۔ خود بخود ہی۔
 آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جاتا تھا۔
 ”کارڈز دیکھنے آئی تھی“۔ وہ دھیرے سے بولی۔
 جس طرح اس کی وحشت کم ہوئی تھی۔ اسی طرح تاجیہ کا بھی خوف معدوم
 ہونے لگا تھا۔

”تو؟“ وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
 اس کی نظروں میں اب وہ ناگواری اور چہرے پر وہ بیزاری نہیں رہی تھی۔
 بس سنجیدگی تھی۔
 وہ پلکیں جھپکنے لگی۔

چند ثانیے اسے تکتے رہنے کے بعد اس نے ایک طرف قدم بڑھا دیئے۔
 تاجیہ نے نجات کی سانس لی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی۔
 کہاں جائے وہ؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔
 ایک شپ۔۔۔ محدود سی جگہ۔
 کبھی کوریڈور، کبھی لاؤنج، کبھی ڈیک اور اب یہاں۔
 کہیں نہ کہیں مل ضرور جاتا تھا۔

اور پھر اس کا رویہ؟ نہ سمجھ میں آنے والا۔
 یہ رویہ خاص طور سے صرف اسی کے ساتھ روا رکھا گیا تھا۔
 اس میں اب کسی شک کی گنجائش نہ تھی۔
 ڈزینیل ہو چکی تھی۔ سب مہمان لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی آئی
 اور بچتی کے ساتھ اوپر گئی۔
 میز پر انگریز جوڑا پہلے سے موجود تھا۔ باتوں کے دوران ان تینوں نے کھانا
 شروع کر دیا۔

جانِ عالم کی سیٹ خالی تھی۔ آیا نہیں تھا شاید ابھی تک یا پھر لُنج کی طرح ڈنر بھی اپنے کیمین میں کھاتا ہوگا۔

بہر حال۔۔۔ وہ خوش تھی کہ وہ نہیں تھا۔ کم از کم کھانا تو آرام سے کھا رہی تھی۔ اس کی موجودگی میں تو اس سے ٹھیک سے کھایا بھی نہیں جاتا تھا۔

موا ایک طرف سے ایک نسوانی قہقہہ ابھرا۔

ناجیہ کی نظریں اس طرف اٹھیں۔

بار والے سرے پر ایک تنہا گوشے میں لگی میز پر جانِ عالم اکیلا بیٹھا تھا۔ پنجرز میں سے ہی ایک فرنج لڑکی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ اس پر جھکی کھڑی تھی۔ لڑکی اب بھی ہنس رہی تھی۔ یقیناً جانِ عالم کی کسی بات پر۔

اس کی باتیں بہت ذومعنی، دلچسپ اور بسا اوقات مزاح سے پر ہوا کرتی تھیں۔ یہ اس نے ایک دو بار پہلے بھی نوٹ کیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی اس کے پاس سے چلی گئی۔

اس کا خیال جھٹک کر وہ دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔

گوشت آج مزیدار رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔

گاہے گاہے نظریں آس پاس پنجرز پر ڈال لیتی۔

ایک دو بار غیر ارادی طور پر اس کی نظر دور تنہا کونے والی میز کی طرف اٹھی۔

وہ کھانے میں مصروف تھا۔ اسی مخصوص شاہانہ انداز میں۔ اس کے ارد گرد کی

فضا تک میں دب دبہ چا بسا معلوم ہو رہا تھا۔

ڈنر کے دوران پیکیجز پر ناؤنس ہوا۔ کل صبح وہ لوگ جرمنی کی سرحد پار کرنے

والے تھے۔ اس لئے کوریئران کے پاسپورٹ اکٹھے کرنا چاہتی تھی۔

ڈنر کے بعد وہ آئنی اور چمبلی ٹاؤن کا چکر لگانے نکلے۔

شام کے ملے جیسیا یوں میں۔ بیٹوں کی جھلملاتی روشنیوں میں۔ انہوں نے

ٹاؤن ہال دیکھا۔ وہیں قریب ہی واقع کھینڈرل دیکھا۔

اور — قریبی گلیوں کا چکر کاٹتے ہوئے وہ لوگ واپس آ گئے۔
 لاؤنج میں اور بھی کئی پنجر بیٹھے تھے۔ کچھ پڑھنے میں منہمک تھے۔ کچھ پینے
 پلانے میں۔

وہ تینوں بھی کھڑکیوں کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
 باہر اندھیرا تھا۔ اوپر آسمان پر بھی، نیچے پانیوں میں بھی کبھی کبھار ایک
 آدھ بوٹ کے گزرنے سے پانی میں روشنی کی لیکر بن جاتی اور بس۔
 رخ اندر کی طرف کر کے اس نے ایک سرسری نظر لاؤنج پر ڈالی۔
 مخالف سمت کھڑکی کے قریب جان عالم بیٹھا تھا۔ ساتھ ہی وہی ایرانی لڑکی
 تھی۔ دونوں باتوں میں مشغول تھے۔ لڑکی خاصی خوش اور محو نظر آ رہی تھی۔
 تھوڑی دیر اور بیٹھنے کے بعد — وہ آنٹی کے ساتھ — نیچے سونے کے لئے چلی
 آئی۔

※ — ※



آج رات وہ کل سے بہتر محسوس کر رہی تھی۔
 جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی۔
 جسمانی تھکاوٹ تو کوئی خاص ہوئی نہیں تھی۔
 ذہنی طور پر بھی۔ وہ جیسے بھی تھا کل سے بہتر تھا۔
 اگر نظروں میں ناگواری یا بیزاری آئی بھی تو وقتی طور پر۔
 بعد میں وہ معمول پر آ جاتا تھا۔ بلکہ بہت سنجیدہ، چپ چاپ سا نظر آنے لگتا تھا۔
 معا سے ایرانی لڑکی کا خیال آیا۔ تھوڑی دیر قبل ہی اس نے اسے لاؤنج میں
 اس لڑکی کے ساتھ محو گفتگو دیکھا تھا۔ وہ خاصا خوش نگ رہا تھا۔
 اس سے پہلے۔ ڈنر پر۔ وہ فرنج لڑکی جو اس کے کندھے پر جھکی کھڑی

تھی۔ تب بھی۔ وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھا۔
پھر؟

وہ پھر سے الجھنے لگی۔

اور قبل اس کے کہ وہ مزید سوچ کر مزید الجھتی۔

اس نے جلدی سے کروٹ بدلی۔ ذہن سے ہر خیال جھٹکا۔ اور آنکھیں موند لیں۔

اگلی صبح ان کا شبِ جرمی کی سرحد میں داخل ہو گیا۔

وہ لاؤنج میں کھڑکی کے پاس بیٹھی انگریزی اخبار کی سرخیوں پر سرسری نظریں دوڑا رہی تھی کہ اس نے دیکھا ان کے رواں دواں شب کی سرکراتی لہروں سے برسرِ پیکار ایک کسم بوٹ آ کر بالا خرشب سے لگ گئی۔ ایک کسم آفیسر اس میں سے نکل کر شب پر آیا۔ ایہارکیشن گیٹ کے پاس ہی جانِ عالم بھی کھڑا تھا۔ کسم آفیسر نے اس سے نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا۔ پھر کسم آفیسر ریسپشن کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دیر وہاں رہنے کے بعد واپس اپنی بوٹ پر چلا گیا۔

وہ پھر سے اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

تبھی جتنی اور آنٹی آ کر اسے بھی اپنے ساتھ اوپر ڈیک پر لے گئے۔

کئی عورتیں، کئی مرد کرسیوں پر بیٹھے دھوپ سیک رہے تھے۔

وہ لوگ بھی ایک طرف کرسیاں کھسکا کر بیٹھ گئے۔

جتنی نے کل ٹاؤن میں خریدے سوئس ناجیہ اور آنٹی کو پیش کئے۔

سوئٹ لیتے لیتے ناجیہ نے دیکھا۔ جانِ عالم میزِ حیاں چڑھ کر اوپر ڈیک پر

آیا۔ اور پھر اپنے تلے قدم اٹھا تا کپشن کو ارٹرز کی میزِ حیاں چڑھ گیا۔

پھر اس نے دیکھا جانِ عالم نے کپشن کو اشارہ کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو

جانِ عالم نے اس کی سیٹ پر بیٹھ کر بڑا سا ویل تھام لیا۔ کپشن قریب ہی سٹول پر

بیٹھ گیا۔ دونوں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ تبھی سٹورڈیس ان دونوں کے لئے

چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔ دونوں چائے پینے لگے۔ کپشن فارغ ہوا تو کوارٹر

چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔ دونوں چائے پینے لگے۔ کیپٹن فارغ ہوا تو کوارٹر سے نکل کر ڈیک پر آ گیا۔

”ہیلو کیپٹن“۔ تاجیہ کے پاس سے ہی مسٹر مارٹن نے اسے گریٹ کیا۔

وہ مسکراتا ہوا ان کے قریب آ کھڑا ہوا۔

کیپٹن ڈچ تھا۔ جیسا کہ اس نے مسٹر اور مسز مارٹن کو بتایا۔

”تمہارا ملک بہت خوبصورت ہے۔ سرسبز اور زرخیز ...“ مسز مارٹن انگریزی میں کہنے لگیں۔

”Because this is Holland.“ کیپٹن بڑے فخر سے بولا۔

”سنا ہے وہاں سیلاب آنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے“۔ باتونی سی مسز مارٹن پھر بولیں۔

”در اصل ہالینڈ کا بیشتر حصہ سمندر کی سطح سے نیچے ہے۔ ہک آف ہالینڈ سے لے کر ایمسٹرڈیم تک آتے ہوئے جتنی بھی کینالز ہیں۔ ان میں پانی سختی سے کنٹرول کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر ہوا اگلے رن، ریلوے لہر بہت اونچی ہو تو سخت سیلاب آنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ سیلاب کو روکنے کی ہر ممکن تدابیر اس موجود ہیں۔“ کیپٹن بڑے خوشگوار اور فخریہ انداز میں اپنے ملک کی باتیں بتا رہا تھا۔ پھر اچانک اس کی نظر کیپٹن برج پر پڑی۔

جان عالم اسے بلارہا تھا۔

”ہمیں اور بھی بتاؤ کیپٹن۔“ مسز مارٹن بے صبری سے بولیں۔

”مسٹر عالم مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ تمام ریور رائٹین کے متعلق جانتے

ہیں۔ انہوں نے ریور رائٹین پر باقاعدہ ریسرچ کی ہے۔“ اس نے جلدی جلدی

کہا۔ اور مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

جان عالم نیچے اتر آیا۔ ایرانی لڑکی جیسے تاک میں بیٹھی تھی۔

فورا ہی اسے جالیا۔

اس کے بازو میں اپنا بازو ڈال لیا۔

”نیچے لاؤ نج میں جاتے ہیں۔“ وہ اسے لئے لئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔
 ”کوئی ڈرنک پیئیں گے۔“

وہیں جان عالم کی نظریں سیڑھیوں کے قریب کرسی پر بیٹھی ناجیہ کی طرف اٹھ گئیں۔

سفید شلوار قمیض پر سفید بڑا سا دوپٹہ لئے وہ دور پانی پر نظریں جمائے تھی۔
 اس کی لمبی چوٹی کرسی کے نیچے فرش کو چھو رہی تھی۔

اس کا سرخ و سفید رنگ کملایا کملایا سا تھا۔ بڑی بڑی شرتی آنکھیں لمبی خمیدہ
 پلکوں کے سائے میں کچھ سوچتی سی لگ رہی تھیں۔

مجتبیٰ کی کسی بات پر چونک کر اس کے پرکشش یا قوتی ہونٹ متبسم ہوئے تھے۔
 تو اس کے بے حد خوبصورت موتیوں سے مشابہ دانت اپنا جلوہ دکھا گئے تھے۔
 وہ حسن مشرق کا نمونہ تھی۔ اور حسن، حیا کے ساتھ ملکر اسے مکمل بنا رہا تھا۔
 معانا جیہ کی نگاہ اس طرف اٹھ گئی۔

اور — ہل بھر میں ہی —

جان عالم کے ثانیہ بھر پہلے کی اس کا حسن و حیا سراہتی نظروں میں تاریکیاں
 اٹھ آئیں۔ پرکشش نقوش پر سائے سے چھا گئے۔

اور پھر — اس نے ناجیہ سے نظریں ہٹالیں۔ سامنے سیڑھیوں کی طرف
 دیکھتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔

کسا تھا یہ سب؟ ناجیہ بے چین ہو اٹھی۔ کہاں جائے؟ جہاں اس کا سامنا نہ
 ہو۔

لنچ ٹیبل پر آج مسٹر، مسر، مائن نظر نہیں آرہے تھے۔ ورنہ عام طور پر وہ
 دونوں پہلے ہی موجود ہوتے تھے۔ پرتھی سیٹ بنا رہا تھا خالی ہی رہتی تھی۔ آنٹی
 اور مجتبیٰ اپنی میز کی طرف بڑھے اور ناجیہ اپنی میر کا طرف۔

ویٹرس نے آکر اس کے سامنے کھانا لگایا۔ مسٹر اور مسز مارٹن کے متعلق دریافت کیا۔ ناجیہ نے لاعلمی ظاہر کی۔ جان عالم کے متعلق ویٹریس نے پوچھا ہی نہیں۔

کھانا شروع کیا ہی تھا کہ جان عالم آ گیا۔
کریم کلر کا قیمتی سوٹ اس کی شخصیت کو مزید مدد برہنہ رہا تھا۔
اس کے مقابل کی اپنی مخصوص کرسی کھینچ کر وہ بیٹھ گیا۔
سر جھکائے وہ آہستہ آہستہ کھانے میں مصروف تھی۔
آج پہلی بار وہ اس کا سامنا اکیلے میں کر رہی تھی۔
چند بل جان عالم اسے بغور دیکھتا رہا۔
”یہ لوگ نہیں آئے؟“ اس کا اشارہ انگریز جوڑے کی طرف تھا۔
وہ جھکا سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

اس کا چہرہ سنجیدہ — اور آنکھیں کسی بھی جذبے سے عاری تھیں۔
”مجھے نہیں معلوم۔“ ناجیہ نے مختصر سا جواب دیا۔
”کہاں رہتی ہیں آپ؟“

”میں... یہاں۔“ اس کے غیر موقع سوال پر وہ ہکا کر رہ گئی۔
”See ا۔“ وہ بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اس کا چہرہ اب بھی سنجیدہ تھا — مگر — آنکھیں جیسے ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اس کی گھبراہٹ اور ہکا ہٹ سے وہ مفلوظ ہوا تھا۔
وہ گھبرا کر پلکیں جھپکنے لگی۔

”کھانا کھائیے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ اس نے مزید کہا۔
اور وہ — مزید گھبرا گئی۔

وہ — اور اس سے نرمی سے، طریتے سے بات کرے؟
یا تو اسے کچھ ہو گیا تھا اور یا خود ناجیہ ہی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

جانے کیسے؟ گھبراہٹ میں ہی اس کا پاؤں میز کے نیچے جان کے پاؤں سے جا لکرایا۔

”Mind your foot Ma'am“ اس کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا۔ مجھ سے فری ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس کے چہرے پر وہی سائے اٹھ آئے۔ آنکھوں میں وہی تھنک دکھائی دی۔

اور۔۔۔ ناجیہ کو لگا۔ اس نے انتہا کر دی تھی۔

اب وہ مزید خاموش نہ رہ سکتی تھی۔

”میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ اسی دن سے جس دن سے میں اس شپ پر آئی ہوں۔ فری ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ سختی سے بولی۔

اور۔۔۔ وہ جیسے چونک سا گیا۔

جیسے اسے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔

ناجیہ نے کھانا بھی نہیں چھوڑا۔ اول تو اس لئے کہ وہ اس کے لئے کھانا کیوں چھوڑے؟ دوسرے یہ کہ اس کھانے پر اس کا بھی اتنا ہی حق تھا جتنا خود جان عالم کا۔

وہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔ اس کے خوبصورت ماتھے پر شکن ضرور تھے۔

مگر پہلے والی گھبراہٹ یا سہماہٹ کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

شاید اس لئے کہ اب اس نے مقابلہ کرنے کا سوچ لیا تھا۔

ویٹر لیس نے جان عالم کے سامنے بھی کھانا لگا لیا تھا۔

وہ بھی کھانے میں مصروف ہو گیا۔

”دو تین گھنٹے کے بعد شپ ڈزل ڈورف میں لگ جائے گا۔ آپ وہاں

گھومیں گی تو آپ کو اندازہ ہوگا۔ وہاں کے شوپنگ سنٹرز بہت خوبصورت ہیں۔

دیکھنے کے قابل ہیں۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ پھر پہلی کی سی سنجیدگی سے

جیسے دونوں کے درمیان کوئی تکی ہوئی ہی نہ تھی۔

ناجیہ نے جھکا سراٹھایا۔

اس کی خوبصورت آنکھوں میں غصہ بھی تھا، احساس تو ہیں بھی۔

”وہاں شوپنگ سنٹرز میں ریٹورائٹس بھی ہیں۔ کوئی ٹھنڈی چیز ضرور ہیں۔“

اس کا لہجہ مصالحت لئے تھا۔

اسکے غصہ پر اس نے لطیف چوٹ کی تھی۔

باقی لوگوں سے جس طرح بات کرتا تھا اس کے ساتھ بھی کی تھی۔

”اور وہ ٹھنڈی چیز آپ شب پر بھی دس بارہ دن کا ساتھ لیتے آئیے

گا۔ تاکہ باقی کے دن آپ کا نمبر پچر ٹارل رکھ سکے۔“ نیپکن سے ہاتھ پونچھتی وہ

کرسی پر سے اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔

جان عالم نے اس کی طرف دیکھا۔

چہرے پر وہی سنجیدگی تھی۔ مگر۔۔۔ آنکھیں مسکرانے لگی تھیں۔

جیسے اس کی بات اُسے پسند آئی ہو۔

چند لمبے وہ اسے جاتے دیکھتا رہا۔

آنکھوں کے ساتھ ساتھ لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھری۔

مگر لمحوں میں ہی۔۔۔ پھر اس کے نقوش تاریک ہو گئے۔ آنکھیں خالی خالی

لگنے لگیں۔

شب ڈزل ڈورف میں لگ چکا تھا۔

مجتبیٰ نے ٹیکسی لی۔ اور تینوں جلد ہی شہر پہنچ گئے۔

واقعی شوپنگ سنٹرز دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ کارپنڈ، ہلکی خوشبو سے مہکتے

ہوئے، موسیقی کی مدد وحنوں سے آراستہ۔

انہوں نے چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ باہر نکلے۔ شووٹ ووز میں بھی چیزیں

اندر سے بھی زیادہ دلکش تھیں۔ انہوں نے قریبی ریستورنٹ میں چائے پی اور
شام ہونے سے قبل واپس شپ پر آ گئے۔

باتھ روم میں نہا کر اس نے کپڑے بدلے۔ بھیکے بالوں کے گرد تولیہ لپیٹا اور
تیز تیز چلتی اپنے کیمن کی طرف بڑھی۔
ایک جھٹکے سے کیمن کا دروازہ کھولا۔

کیمن کشادہ اور اجنبی اجنبی سا تھا۔ قالین گداز اور قیمتی پردوں کا رنگ بھی
اور تھا۔ جدید آرام دہ صوفے کے علاوہ — ایک طرف میز کے ساتھ لگی دو
کریاں اور فرج بھی تھا۔ دیوار پر آویزاں قیمتی پینٹنگ تھی۔ اٹیچڈ باتھ تھا
اور — اور — بستر پر جان عالم اونڈھا لیٹا تھا۔

اوہ — وہ اپنی دھن میں کہاں آنکلی تھی؟

اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

”پھر آپ کہتی ہیں فری ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“۔ اچانک ہی وہ

سیدھا ہو بیٹھا۔

ایک دفعہ پھر اس کے لب و لہجے میں طنز نمایاں تھا، تھیک آٹھ رات تھی۔

ٹھیک تو کہتا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ پہلے ہی وہ بدظن تھا وہ اس کے کیمن پر
آدم کی تھی۔ نادانستگی میں — مگر ثبوت کیا تھا؟

کوئی جواب دیئے بنا وہ مڑتے ہوئے پاس ہی اپنے کیمن میں آ کر اپنے

بستر پر پڑ رہی۔

اس وقت ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

باوجود آنٹی کے اصرار کے وہ ڈر پر بھی نہیں گئی۔

یوں ہی حکمن کا بہانہ کر کے اپنے کیمن میں مقید رہی۔

شام کا اندھیرا ہر سو پھیلنے لگا تھا۔

بستر پر پڑے پڑے اور سوچے سوچے وہ غڈ حال ہو گئی تھی۔

اٹھ کر اس نے سرخ متورم آنکھوں پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ ہونٹوں پر سرسری سائرش پھیرا۔ اور دھیرے دھیرے چلتی اوپر ٹیک پر آ گئی۔
اندھیرا تھا ہر سو۔ بھیگا بھیگا اور خشک ماحول تھا۔ ستارے ٹٹمارہے تھے یا پھر دورا بھرتا چاند تھا۔ اسے سکون کا احساس ہوا۔
ریٹنگ سے فیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

مگر سکون کے احساس کے ساتھ ساتھ اسے پھر پچھلا واقعہ یاد آ گیا۔
کیا وہ سمجھتا نہیں تھا کہ یہ سب غلطی سے ہوا تھا؟ آخر اسے کیوں یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ فری ہونے کی کوشش کر رہی ہے؟ جب سے وہ شپ پر آئی تھی۔ ”فری“ کا لفظ اس نے تیسری بار استعمال کیا تھا۔
اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔
”تم ڈنر پر نہیں آئیں۔“ جانے کس وقت آ گیا تھا وہ؟ بالکل قریب سے بولا۔

اس نے جلدی سے پلکیں جمپک لیں۔ رخ اس کی طرف کئے بغیر ہی۔
جان عالم کی نظریں اس کے سراپے پر۔ کھلے بھیکے لمبے بالوں پر تھیں۔
”ہوں۔“ کیوں نہیں آئیں؟“۔ وہ پھر آہستہ سے پوچھنے لگا۔
اور۔۔۔ ناچہ کو لگا تعجب کے اس کے اس نئے انداز کو وہ مزید برداشت نہ کر سکے گی۔ اس کی چیخیں نکل جائیں گی۔

”آپ چلے جائیں یہاں سے۔“ اس کی طرف رخ کرتے ہوئے اس نے بمشکل کہا۔ آنسوؤں نے اس کا گلہ۔ اس کی آواز تک روک لئے تھے۔
”اوہ۔“ اس کے لہجے میں تاسف تھا جیسے۔۔۔ پشیمانی تھی۔۔۔ میں کوشش کروں گا آئندہ جہیں hurt نہیں کروں گا۔“ اس کی سرخ متورم آنکھوں اور گالوں پر بہتے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے وہ متاسف سا بولا۔
اس کی گھمبیر آواز میں دکھ تھا۔ پرکشش چہرے پر کرب تھا۔

گرے اش آنکھیں مکھائیل تھیں — اور — اور شاہانہ جاہ و جلال مجروح تھا۔

تھکے تھکے، نڈھال سے قدم اٹھاتا — وہ نیچے چل دیا۔

اور — ناجیہ تھک کر پاس پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ کیا تھا یہ سب؟ کیا کرے وہ؟ کہاں جائے؟

وہ تو خود — ایسا چور چور، ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ — وہ کیا آگے سے ڈھانے کی کوشش کرتی۔

سردی گھرائی تھی۔ اس کے کپڑے نا کافی تھے۔ اٹھ کر واپس نیچے اترنے لگی۔ نیچے لاؤنج میں ہلچل تھی، زندگی تھی۔

مگر یہ سب شاید اس کے لئے نہیں تھا۔ رخ پھیر کر وہ وہاں سے بھی نیچے اتر آئی۔ کیبنوں کی طرف۔

کیبن کھول کر اس نے رات کے کپڑے بدلے۔ لایٹ آف کیا اور بستر پر لیٹ گئی۔

تبھی دوازے پر دستک ہوئی۔ اٹھ کر اس نے دروازہ کھولا۔

سٹیورڈس تھی، کھانے کی ٹرے لئے کھڑی تھی۔

اسے حیرت سی ہوئی۔

”مسٹر عالم نے کہا تھا آپ کا کھانا آپ کے کیبن میں پہنچایا جائے“۔ ساتھ

ہی وہ اندر آئی۔ میز پر ٹرے رکھی اور مسکراتے ہوئے واپس چل دی۔

وہ اتنا بھی نہ کہہ سکی۔ کہ اسے بھوک نہیں ہے۔

اور پھر مسٹر عالم کو کب سے اس کی اتنی فکر لگ گئی تھی۔ اور پھر وہ چونکی۔ شپ

کے یہ سب لوگ اس کا ہر حکم کیوں بجالاتے تھے۔

دروازہ بند کر کے وہ ٹرے کے پاس آئی۔ کھانے پر ایک نظر ڈالی۔ بھوک

چمک سی اٹھی — مگر —

وہ کھا لیتی تو— ہار نہ جاتی۔ ”مسٹر— جان عالم“ سے۔ وہ زیر لب
بڑبڑاتی۔

اور کھانا کھائے بغیر ہی بستر پر لیٹ گئی۔

پتہ نہیں کیا ہوا تھا؟ اس سے سخت نفرت ہونے کے باوجود— وہ کچھ ہلکا ہلکا
سامحوس کر رہی تھی۔

اسے دکھی اور مجروح دیکھ کر شاید— مگر یہ سب دیکھ کر تو اسے افسوس ہوا
تھا۔

پھر؟

”تم ڈنر پر نہیں آئیں۔“

”ہوں— کیوں نہیں آئیں؟“

اس کی آواز بار بار اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ گھمبیری، متاسف

سی۔ اور— اور— کچھ اپنائیت سی لگتی۔

رات پھر وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ دیر تک اسے بھی جگائے رکھا۔

※—※

انجنوں کے ارتعاش سے آج پھر اس کی نیند کھل گئی۔ یہی ہوتا تھا۔ صبح پانچ بجے کے قریب انجنوں کے سارٹ ہونے کا۔ بے ہنگم سا شور اٹھتا تھا۔ اور پھر دھیرے دھیرے شب کے چل پڑنے کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگتی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ آئی۔ ایک نظر کھلی کھڑکی میں سے دیکھا۔ سورج طلوع ہونے کے آثار تھے۔ آسمان صاف تھا اور تازہ تھا۔ پانی طلوع آفتاب کے سنہری، گلابی رنگ میں رنگا جا رہا تھا۔ شب آہستہ آہستہ پانی کی لہروں سے برسرِ پیکار تھا۔ پلٹ کر اس نے کونے پرکا پردہ سرکایا۔ اور واش بیسن میں منہ ہاتھ دھونے لگی۔

اس نے گرے کاٹن کی مروں کا لرا اور کفوں والی قمیض، گرے کاٹن کی شلوار اور مروں شیفون کا دوپٹہ لیا۔ گرے لیدر کے شوز پہنے۔ بالوں کی ڈھیلی چوٹی بنائی۔ باہر نکل کر کیمین بند کیا اور آنٹی کی طرف آگئی۔ آنٹی حسب معمول بستر میں ہی بیڈٹی پی رہی تھیں۔ خود ناجیہ نے ویٹر لیس سے کہہ کر اپنی بیڈٹی بند کروادی تھی۔ چائے کی وہ خاص شوقین نہ تھی۔

مجتبیٰ بھی تیار ہو کر آگیا۔ تو تینوں ناشتے کے لئے اوپر لاونچ میں آگئے۔ حسب معمول اس کی میز پر انگریز جوڑا پہلے سے موجود تھا۔

اور۔۔۔ خلاف معمول جان عالم آج کچھ پہلے ہی آ کر بیٹھ چکا تھا۔ ”گڈ مورننگ“۔۔۔ دھیرے سے کہتی وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”گڈ مورننگ“۔۔۔ جوڑے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

جان عالم کی نظریں صرف ایک لمحے کو اوپر اٹھیں۔ اور پھر اپنے سامنے پلیٹ پر جم گئیں۔

سرخ، ہنسی ہوئی آنکھیں۔ مضحل چہرہ۔

ناجیہ تو اس کی وجہ سے پریشان رہتی تھی۔ وہ ہی اسے چین لینے نہیں دیتا تھا۔ مگر۔۔۔ اس کو کیا پریشانی تھی؟ اسے کس چیز نے بے چین کیا ہوا تھا؟ سوچنے کے باوجود وہ کوئی حل نہ پاسکی۔

دونوں انگریز میاں بیوی ناشتے کے ساتھ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ آپس میں بھی اور کبھی کبھی ناجیہ کے ساتھ بھی۔

جان عالم خاموش تھا۔ اور اس کی گہری خاموشی دیکھ کر ہی شاید انگریز جوڑا اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ دونوں اپنے بیٹے کے بارے میں جو کہ انگلش آرمی میں کیپٹن تھا بات کر رہے تھے۔

”تم نے بتایا تھا کہ تمہارے فادر بھی آرمی میں ہیں“۔ اچانک مسز مارٹن

نے ناجیہ کو مخاطب کیا۔

”جی وہ پاکستان آرمی میں بریگیڈیئر ہیں۔“

اور۔۔۔ جان عالم نے جیسے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

اور پھر۔۔۔ وہی تاریک سائے پر کشش چہرے پر چھانے لگے۔ وہی تلخی
دلنشین آنکھوں میں اترنے لگی۔

”ناجیہ اس کی کیفیت بھانپتے ہی گھبرا سی گئی۔“

یہی وہ وقت ہوتا تھا۔ جب وہ اسے کچھ نہ کچھ ضرور کہہ دیتا تھا۔ تلخ، توہین
آمیز۔

مگر پھر اس نے اپنی توجہ اپنے ناشتے پر لگا دی۔

انتہا پر پہنچنے سے پہلے ہی۔۔۔ تلخی، تضحیک کو بند باندھ دیا تھا جیسے۔

اس کے لئے اس نے کتنے ضبط سے کام لیا تھا۔ یہ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ
اور سختی سے جڑے ہوئے جڑے بتا رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ معمول پر آ رہا تھا۔

چائے کا کپ لئے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پی رہی تھی۔۔۔ بظاہر خاموش اور
پرسکون بنی۔

مگر۔۔۔ من میں کئی سوال تھے۔ ہلچل تھی۔

”رات تم نے یہ نہیں کہا کہ تم مجھے شوٹ کر دو گی۔“۔۔۔ سپاٹ سا چہرہ لئے وہ

اچانک بولا۔

”جی؟“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگی۔

”ایک بریگیڈیئر کی بیٹی ہو کر تمہیں مجھے شوٹ کر دینے کی دھمکی دینی چاہئے

تھی۔ تاکہ چپ چاپ وہاں سے چلے آنے کو کہہ دیا۔“۔۔۔ اس کی آنکھوں میں
اداسی تھی، کرب تھا ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی جو زخمی تھی، گھائیل تھی۔

وہ تھک سی گئی۔ طنز و تشنیع چھوڑ کر۔ اب تو وہ اسے دکھی کر رہا تھا۔

کیوں اتنا دکھی تھا؟ اتنا گھائیل — کہ دوسروں کو بھی دکھی بنارہا تھا۔
مگر — وہ ہی کیوں دکھی ہو رہی تھی؟ اس کے لبوں پر تلخی ابھر آئی۔
اتنی جلدی اس کے چپھلے توہین آمیز رویے کو بھول گئی۔
”شوٹ کرنا بریگیڈز کا کام ہے اس کی بیٹی کا نہیں۔“ اب کے اس کے لہجے
میں بھی طنز تھا، تلخی تھی۔

”Mind you — میں نے شوٹ کرنے کی ’دھمکی‘ کہا ہے۔ شوٹ کرنا
نہیں کہا۔“ آنکھوں کی اداسی معدوم اور مسکراہٹ کا زخمی پن معمول پر آ رہے
تھے۔

اور — ناجیہ نے گہری سانس لی۔
اس کا مقابلہ — کم از کم وہ نہیں کر سکتی تھی۔
”تمہارے بال بہت لمبے اور خوبصورت ہیں۔“ مسز مارٹن اس کے لمبے
بالوں کو تو صلی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک بار پھر بولیں۔
اور — جان عالم ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

”Well , I hate long hair“.
اسے جیسے اپنے آپ پر قابو ہی نہیں رہا۔
اسے پھر اچانک کیا ہو گیا تھا؟ پاس بیٹھے لوگوں کا بھی خیال نہیں تھا۔
خود وہ تو کچھ کچھ اسے سمجھنے ہی لگی تھی۔ اسے hurt تو کر جاتا تھا — مگر بعد
میں — کسی بھی طرح اس کی تلافی بھی کر لیتا تھا۔

”Had your girl friend long hair?“ — مسز مارٹن نے
مسکرا کر پوچھا۔

”I ‘m sorry, any way,“ — وہ جیسے مسز مارٹن کے آگے شرمندہ
تھا۔

اور — جس کے بالوں پر بولا تھا — اس کی شاید کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔

”تمہارے ہال واقعی بہت لمبے اور خوبصورت ہیں۔ لیکن...“
 ”لیکن میرے ہیں اس لئے آپ کو ان سے نفرت ہے۔“

اب وہ حسب معمول سلامتی کرنے لگا تھا۔ مگر اس کی توہین کر لینے کے بعد۔
 خالی کپ میز پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ انگریز جوڑے سے معذرت چاہی
 اور اوپر ٹیک کے لئے چل دی۔

مزمز مارٹن مسکرا دیں۔ ان دونوں کی باتوں کے لڑائی کے سے انداز پر
 شاید۔

لڑائی۔ جو کئی دنوں سے جاری تھی۔ خاموشی سے، چپ چاپ۔

اوپر اور بھی کئی پنجرے تھے۔ خوش خوش دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کئی عورتیں ٹین
 لوشن جسموں پر لگائے مختصر ترین لباس پہنے کرسیوں پر نیم دراز تھیں۔
 یورپ کو اس قدر قریب سے دیکھنے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔
 وہ رینگ کے قریب بیچ پر بیٹھ گئی۔

بارج اور سیٹمز آ جا رہے تھے۔ طرح طرح کی چھوٹی بڑی کشتیوں کے
 درمیان بڑے جہاز بھی نظر آ جاتے تھے۔ ساحل پر کبھی کبھی کوئی خاندان پک پک
 مناتا بھی نظر آ جاتا۔

”تجبی۔ جان عالم بھی اوپر آ گیا۔ وہی ایرانی لڑکی ساتھ تھی۔ وہ دونوں
 بھی اسی سمت آ گئے۔“

”... ہاں کیپٹن اپنی بیوی بھی شپ پر رکھ سکتا ہے۔ وہیں بسا اوقات بچے بھی
 پیدا ہو جاتے ہیں...“ رینگ سے نکا وہ لڑکی کو بتا رہا تھا۔

مسٹر عالم نے ریور رائیمن پر ریسرچ کیا ہے۔ اسے کیپٹن کی بات یاد آ گئی۔
 واقعی اس کی کافی تالچ تھی اس فیلڈ میں۔

”... جب ان کی عمر سکول جانے کے قابل ہوتی ہے تو یا تو مائیں ساحل پر

چلی جاتی ہیں۔ یا پھر انہیں خاص طور سے 'سی مین' کے بچوں کے لئے بنائے گئے سکولوں میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ہالینڈ میں تو اکثر بچے اپنے والدین کے پاس شپ میں ہی رہتے ہیں۔ رائین پرکئی ڈچ فلوئنگ سکول موجود ہیں۔ جنہیں پانی پر رہنے والے بچے اٹینڈ کرتے ہیں۔۔۔“

”اچھا اب اور باتیں کرتے ہیں۔“ ایرانی لڑکی کو جیسے اس ذکر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

”کون سی باتیں؟“

”میرے متعلق۔“

”تمہارے متعلق؟ اوہ یس۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

اُس کے لب و لہجہ اور جان بوجھ کر انجان بننے پر لڑکی بے اختیار ہنس دی۔

”مہ پارہ۔ نام تو آپ کو معلوم ہے اور باتیں کرتے ہیں۔“

مثلاً؟“

”میرے متعلق۔ میں آپ کو کیسی لگتی ہوں۔“

وہ کچھ سوچنے لگا جیسے۔

”مجھے ایرانی ہمیشہ بہت اچھے لگے ہیں۔ اور تم انہی میں سے ہو۔ پھر۔۔

لڑکی ہو۔“ اس کی ہنسی بہت جاندار تھی۔

مہ پارہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”آئیے وہاں بیٹھتے ہیں۔“ اس نے دور ایک اکیلے گوشے کی طرف اشارہ

کیا۔

”وہاں۔ وہاں کیا ہے؟“

ناچیہ کی پیٹھ تھی۔ مگر سب صاف سن رہی تھی۔

”تمہائی۔ اور مجھے تمہائی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ جب آپ میرے

پاس ہوتے ہیں۔“

”اوہ“۔

ناجیہ جان عالم کا رد عمل نہ دیکھ سکی۔ مگر اتنا تو وہ بھی سمجھ سکتی تھی۔ چند روز سے ایرانی لڑکی جو اس کے پیچھے سائے کی طرح لگی رہتی تھی۔ اس کا مطلب کیا تھا؟
 ”آئیں نا“۔ مہ پارہ نے پھر اصرار کیا۔
 ”چلو“۔

وہ دونوں آگے بڑھے تھے۔ تو ناجیہ نیچے اتر آئی تھی۔

دوپہر کے قریب وہ لوگ بون پہنچ گئے۔

شب کا عملہ شب لگانے میں مصروف تھا۔ وہ اپنے کیمپ سے نکل کر ریسپشن ڈیسک پر آگئی۔ اس روز تو کارڈز نہ لے سکی تھی۔ سو چا آج تسلی سے دیکھے گی۔
 طرح طرح کے خوبصورت کارڈز لگے تھے۔ ریور رائٹین کے آس پاس کے علاقوں کے۔ خود اس شب کے۔

اور اس نے باقی کارڈز کے ساتھ ساتھ شب کے بھی الگ کر لئے۔
 دفعتاً نیچے پلیٹ فارم پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔
 اس نے مڑتے ہوئے دیکھا۔

ایک آدمی اس میں سے نکل کر تیزی سے گینگ وے پر اوپر آ رہا تھا۔
 ساتھ ہی ادھر لائن میں سے جان عالم نمودار ہوا۔ جیسے اسے ہی دیکھ کر باہر آیا ہو۔
 دونوں ریسپشن کے پاس ہی آکر ملے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔

آدمی نے اس سے گرجوٹی سے مصافحہ کرتے ہوئے ایک لفافہ پکڑا یا۔ ساتھ ہی جرمن زبان میں جیسے کوئی پیغام بھی دیا۔
 ناجیہ قریب کھڑی ان لوگوں کی گفتگو سن رہی تھی۔

جان عالم نے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے کاغذ نکالا۔ ٹیلیگرم یا ٹیلیفون کا

پیغام معلوم ہوتا تھا۔

”باپ رے“ — جان عالم نے بیماری سے سر کھایا۔

آدمی نے سلیوٹ کیا اور چل دیا۔

ناجیہ نے دھیان پھر سے کارڈز پر مڑ دی۔

”کوئی کارڈ پسند آیا؟“ دو قدم چل کر وہ پاس چلا آیا۔

”نہیں۔“ وہ اپنے لئے الگ کئے کارڈز پر نظریں جمائے تھی۔

اس کی ’نہیں‘ میں تیزی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی تھا۔

اس مبہم سا تبسم جان عالم کے لبوں کو چھو گیا۔

چند ہل یوں ہی کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

ناجیہ رخ سامنے کئے اب بھی خالی خالی نظریں کارڈز پر جمائے تھی۔

اس کی موجودگی سے وہ بے کل سی ہو جاتی تھی۔

”میرے بابا جان آرہے ہیں۔“

وہ بالکل یوں بولا تھا جیسے اپنے کسی اچھے دوست سے مخاطب ہو۔

غیر ارادی طور پر گھوم کر وہ اسے دیکھنے لگی۔

اس وقت اس کے چہرے پر وہ تہ بروہہ سنجیدگی بھی نہیں تھی۔

بلکہ — کچھ بھولپن — معصومیت سی تھی۔

انسان کے کتنے روپ ہیں؟ اس نے سوچا۔

جب وہ اکیلا تھا شپ پر — تو بوس تھا جیسے پورے شپ کا۔

اب اپنے باپ کا ذکر کر رہا تھا۔ تو یکدم ہی جیسے چھوٹا سا تنے لگا تھا، معصوم سا۔

”I love my father very much.“ — اس کی آنکھوں میں

باپ کے لئے عزت، محبت اور جانے کون کون سے جہاں آباد تھے۔

”لیکن مجھے ان سے ڈر بھی بہت لگتا ہے۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی — وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

جیسی تھوڑی دیر قبل پیغام پا کر وہ باپ رے بولا تھا۔
 ”شکر ہے کوئی تو ہے اس دنیا میں جس سے آپکو بھی ڈر لگتا ہے۔ میرا دل
 چاہتا ہے ان سے ملوں ...“

ناریک سائیوں نے اچانک اس کے معصوم چہرے پر یانار کر دیا گرے اش
 آنکھوں میں کرب تڑپ اٹھا۔

”لیکن وہ ایسا کبھی نہیں چاہیں گے۔“ وہ بے حد تنہائی سے بولا۔
 اور۔۔۔ آگے بڑھ کر ریسپشن کا دروازہ کھولتے ہوئے منبر کی طرف بڑھا۔
 وہ حیران سی۔۔۔ نادم سی کھڑی رہ گئی۔

ایک بار پھر۔۔۔ اسے اپنی توہین کا شدید احساس ہوا۔
 کارڈز کی ادائیگی کر کے وہ نیچے آ گئی۔

لنچ کے بعد وہ آنٹی اور منجی کے ساتھ Beethoven's Birth
 Place اور کنسرٹ ہال جو Beethoven ہی کے نام پر تھا، دیکھنے چلی گئی۔
 اس کا ذہن اب بھی اپنی توہین کا احساس لئے تھا۔ وہ رہ رہ کر اس کی بے
 عزتی کر رہا تھا۔ کبھی بہت دوست بن کر قریب آ کر، اور کبھی براہ راست۔ پر
 توہین بہر حال کرتا تھا۔

وہ الجھی الجھی اور اداس سی تھی۔ اس آدمی نے تو اسے چین سے نہ رہنے کی
 جیسے قسم اٹھا رکھی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا وہ نہ ہی آئی ہوتی اس کو روز پر۔
 مگر پھر۔۔۔ اس نے سوچا۔ اس کے بعد اس کی کسی بات پر دھوکہ نہیں
 کھائے گی۔ اچھی طرح Ignore کرے گی۔ اپنا باقی کا سفر اچھا گزارے
 گی۔ وہ سیر کی لطف اٹھانے آئی تھی تاکہ اس کی مرہون منت بن کر۔
 یہ سوچتے ہی اسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔

اور پھر وہ۔۔۔ نئے عزم کے ساتھ بون کے تقریباً ہر اہم جگہ پر گئی۔
 تینوں خوب لطف اندوز ہوئے۔ منجی بھی ناجیہ کو کسی طرح متوجہ نہ پا کر اب۔

بھائی ہی بن گیا تھا۔ سیر کا مزہ دو بالا ہو گیا۔
 خوب خوب تھک جانے کے بعد وہ تینوں واپس لوٹے۔
 شپ پر پہنچے تو جیسے بھونچال آ گیا تھا۔
 تمام عملہ چوکس و مستعد ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا۔
 پورے شپ کی صفائی اڑسیر لو ہوئی تھی۔ ہر سو فریشنز کی مسکور کن مہک تھی۔
 لاؤنج میں موسیقی ہلکی دھنیں بکھیر رہی تھی۔
 وہ تینوں اپنے اپنے کینوں میں آ گئے۔
 نیم گرم پانی کا شاور لے کر۔ اس نے سبز رنگ کے پھولدار کپڑے،
 ہمرنگ دوپٹہ لیا۔ گیلی بالوں میں برش کر کے پیچھے کیا۔ اور اپنے تلے قدم اٹھاتی
 اوپر لاؤنج میں آ گئی۔
 ٹولس بورڈ پر نظر پڑی۔
 شپ اڈمز مسٹر فخر عالم اپنے بیٹے مسٹر جان عالم کو اس کی اٹھائیسویں سالگرہ پر
 گریٹ کرنے آرہے ہیں۔ آج شام وہ تمام مہمانوں کو ڈنر پر انوائٹ کر رہے
 ہیں۔ ڈنر کے بعد ڈانس کا اہتمام بھی ہوگا۔
 اوہ۔۔۔ تو وہ شپ اڈمز کا بیٹا تھا۔ جیسی اڈمز ایکٹ کر رہا تھا۔
 ”لیکن وہ ایسا کبھی نہیں چاہیں گے“۔ اچانک اسے چند گھنٹے قبل کہی ہوئی اس
 کی بات یاد آ گئی۔
 ”ہونہہ“۔۔۔ وہ تلخی سے بڑبڑائی۔
 اور آگے جا کر کاؤنٹر سے اپنے لئے ایک ڈرنک لیکر واپس اس سرے پر
 آتے ہوئے کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔
 سامنے پانی پر نظریں جمائے وہ مختلف سوچوں میں کھوئی تھی۔
 ”کالر ٹھیک کرو بیچے۔۔۔ وہ کہیں گے“۔ سامنے کی کرسی پر بیٹھے جان عالم کی
 آواز پر چونک کر وہ اس طرف دیکھنے لگی۔ وہ منہ پارہ سے بات کر رہا تھا۔ ”تمہارا

ایک بوٹ اچھی طرح نہیں چمک رہا۔ اور۔ اور۔ اور۔ وہ اپنے کھلے کھلے میں جھانکا۔ ”بٹن بند کرو اپنے۔“ وہ بھاری سی آواز بنا کر کہہ رہا تھا۔ اور مہ پارہ کھلکھلا کر فس دی۔

”اور۔ ان کے سامنے تم میرے قریب بھی نہ آنا۔“ یقیناً وہ اپنے بابا جان کے متعلق بات کر رہا تھا۔

”کیوں؟“

”ایک لڑکے قریب لڑکی کا کیا کام؟ وہ کہیں گے۔“

”اوہ۔ لیکن...“

”کیا؟“

”آپ ان سے میرا تعارف تو کروائیں گے نا۔“

”اوہ تو۔“

”ان سے تعارف ایک ہی لڑکی کا ہو نا اور وہ میری بیوی ہوگی۔ اور۔ اس کا تعارف بھی وہ ہی مجھ سے کروائیں گے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میری بیوی پہلے وہ پسند کریں گے بعد میں مجھے پسند کرنی ہوگی۔“

”یعنی زبردستی۔“

”زبردستی۔“

”آپ کی اپنی کوئی پسند نہیں ہوگی؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”شادی تو آپ کی ہوگی۔“

”پہلے ان کی ہوگی۔ میرا مطلب ہے پہلے وہ پسند کریں گے۔“ وہ

خوبصورتی سے ہنس رہا تھا۔

”اور اگر آپ کو کوئی لڑکی پسند آگئی تو؟“

”میری مجال ہے۔“ اس نے سرکسی کی پشت پر لڑھکا دیا۔

”پھر بھی۔ اگر ایسا ہو گیا تو؟“

”تو۔۔ تو۔“ سیدھا ہوتے ہوئے وہ سامنے بیٹھی ناجیہ کی آنکھوں میں

جھانکا۔ ”میں۔۔ میں۔۔ زہر کھالوں گا۔“

شپٹا کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کا لہجہ معنی خیز سا تھا۔

کیا کہنا چاہتا تھا وہ؟ کیا سمجھنا چاہتا تھا وہ؟

”زہر کیوں کھالیں گے؟“

”اس لئے کہ اگر میں چاہوں بھی تو اسے پانچ سو روپے کی نٹریں

اب بھی ناجیہ پر جی تھیں۔“

”کیا آپ کو آج تک کوئی لڑکی اچھی نہیں لگی؟“

”کیوں نہیں لگی۔ لڑکی ہوگی اور اچھی نہیں لگے گی۔“

اس نے ایک جاندار جتہ لگایا۔

”مذاق چھوڑیں نا۔“

”مشکل ہے۔“

”افوہ۔۔ میں چاہتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی۔

اور۔۔ جان عالم نے سرکسی کی پشت سے نیک کر آنکھیں یوں موند لیں

جیسے اس کے سامنے کوئی موجود ہی نہ ہو۔

کھٹ پٹ کرتی مہ پارہ پل دی۔

اور۔۔ پٹ سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

ناجیہ حیرت سے جان عالم کو دیکھنے لگی۔ کیا آدمی تھا؟

تاجیہ کو اپنی طرف دیکھتے پایا۔ تو پٹ سے کھولی آنکھیں اس نے پوری کھول دیں۔

وہ گھبرا کر پلکیں جھپکانے لگی۔

”یہاں آ جاؤ۔“

اور — تاجیہ نے رخ کھڑکی کی طرف کر دیا۔

چند لمحے وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ دو قدم چل کر اس کے قریب آ گیا۔

”باہر کیا دیکھ رہی ہو۔ ہاں —“ اس نے بھی پانی پر نظریں جمادیں۔

وہ اب بھی کچھ نہیں بولی۔

”یہ — یہ غصہ کس پر ہے؟“ وہ اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

نظریں اٹھا کر وہ اسے دیکھنے لگی۔ چپ۔ چپ۔

شرابی آنکھوں میں بدلیاں سی اند آئی تھیں۔

”میرا مطلب ہے اتنے لوگ ہیں یہاں تو — کہیں مہ پارہ پر تو غصہ نہیں۔“

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”اس کی دلنشین آنکھوں میں شوخی تھی۔ بیڑوں کے گوشے ہنسی کا بار اٹانے

سے قاصر لگ رہے تھے۔“

وہ اب بھی چپ تھی۔ بدلیاں جیسے برسا چاہتی تھیں۔

”میرے بابا جان آرہے ہیں۔ کہیں ان پر — اوہ — ان کے آنے پر تو

غصہ نہیں ہو۔“

اور — دیر سے گھر آئی بدلیاں — برس ہی پڑیں۔

”باپ رے۔“ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا ”ڈوب جاؤں گا۔ بند باندھ لو تا۔“

اور وہ — نادانستگی میں اپنی کمزوری دکھا کر پچھتائی۔

اس نے تو ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرنے کا سوچا تھا۔

مگر — کیسے کیسے جال بنتا تھا۔
 خوبصورت باتیں بتاتا کرالجمھاتا تھا۔
 وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھی اٹھ آیا۔
 وہ اوپر ٹیک پر گئی۔ اور جان عالم مینیجمنٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

✱ — ✱

یہ اس کی دعا ہے
 کہ وہ اپنے
 دل کے
 کلام

ایک سیاہ مرسیڈیز لینڈ ٹک سٹیج کے پاس آ کر کھڑی ہوئی۔

پہلے سے منتظر کھڑا جان عالم آگے بڑھا۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر
تھاما۔

گاڑی سے برآمد ہونے والے مسٹر فخر عالم ہی ہوں گے۔ اوپر ڈیک پر سے
کئی اور پنجرہ کی طرح دیکھتے ہوئے ناچیہ نے سوچا۔

وہی قد، وہی ناک نقشہ — وقت کی گرد کی تہہ قدرے جم گئی تھی بس۔ کھنے
بالوں میں برف کی سی سفیدی گھل مل گئی تھی ذرا۔

وہی اتھارٹی تھی آنکھوں میں۔ وہی کمانڈ تھا سراپے میں۔

وہی رعب، وہی تدبیر — جیسے جان عالم کی کاپی تھے فخر عالم۔

گاڑی سے ایک نوجوان اور برآمد ہوا۔ کوئی عزیز تھا شاید۔ یا دوست وغیرہ۔

شب سے یکے بعد دیگرے تین بلاسٹ ہوئے اپنے اوزر کو سیلوٹ کرنے کے لئے۔

“Congratulations.” فخر عالم نے اسے گلے سے لگایا تھا۔

“Same to you Babajan.”

”ہیلو جان“۔ نوجوان بھی اس سے لپٹ گیا۔

”ہیلو پرویز“۔ ہاؤ آریو“۔

اور پھر۔۔۔ تینوں ہی گینگ وے کی طرف بڑھے۔

فخر عالم نے گینگ وے کے دونوں طرف کھڑے جہاز کے عملے کے سیلوٹ کے جواب میں ہاتھ اوپر بلند کئے تھے۔

اور پھر۔۔۔ اوپر پہنچتے پہنچتے وہ لوگ ناجیہ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

دو گاڑیاں اور آ کر رکیں۔ عملے کے آدمی ڈرنکس، کریٹ اور کھانے پینے کے مختلف سامان اتارنے لگے تھے۔

کچھ دیر پہلے کی شب میں افراتفری اب باقاعدہ ڈسپلن میں بدل گئی تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر اور شب کا عملہ اپنے اپنے کام میں لگ گیا تھا۔

گیلی میں کام اپنے عروج پر تھا۔ ڈنر پر خاص اہتمام جو ہو رہا تھا۔ خاصی گہما گہمی تھی ہر طرف۔

”کُل کوئی کہہ تو رہا تھا کہ شب میں ہمارے ساتھ شب اوزر کا جینا بھی سفر کر رہا ہے۔ مگر بیٹھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ میز پر بیٹھنے والا ہی وہی ہے۔“

اپنے کیمپن میں کرسی پر بیٹھیں آنٹی ناجیہ سے کہنے لگیں۔

”اور کبھی کبھی بہت غور سے ناجیہ کو دیکھتا بھی ہے۔“۔ مجتبیٰ دھیرے سے ناجیہ کے کان کے پاس بولا۔

ایک ہاں کو ناجیہ کا رنگ بدل سا گیا۔
 ”میں نے کبھی غور نہیں کیا۔“ سنہلے ہوئے وہ بھی آہستہ سے بولی۔
 جبکہ۔ غور کر کے وہ تھک چکی تھی۔
 اس کی شخصیت کے ہر پہلو پر سوچ سوچ کر وہ ہار گئی تھی۔

ڈنر گوگ پر وہ تینوں بھی اوپر لاؤنج میں آ گئے۔
 روشنیوں کا جیسے سیلاب آ گیا تھا۔ پھولوں کے گلدستوں سے بچے ہال پر
 پریوں کے دیس کا گمان ہوتا تھا۔ معطر فضا مسور کن تھی اور۔۔۔ مدھر موسیقی روح پرور۔
 ڈائننگ ایریا اسی طرح تھا۔ البتہ باقی کے حصے میں قدرے ردو بدل کر کے
 درمیان میں ایک بڑی میز لگائی گئی تھی۔
 ایسی جگہ۔ جہاں تمام پسینہ خیز جب اپنی اپنی میزوں پر بیٹھتے تو سب کو یہ
 مخصوص میز صاف دکھائی دیتی۔
 میز پر بھی خوبصورت پھول سجے تھے۔ اور ایک طرف۔ ایک بہت بڑا سالگرہ
 ایک دعوت نظارہ دے رہا تھا۔

سب مہمان اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ گئے تھے۔
 سب کی آنکھوں میں تجسس کی چمک تھی۔ خوشی تھی۔
 تبھی۔۔۔ دروازے سے پہلے فخر عالم اور جان عالم نمودار ہوئے۔
 بعد میں پرویز اور شپ کا کیپٹن۔
 سبھی نے تالیوں کی گونج میں ان کا خیر مقدم کیا۔
 وہ لوگ مخصوص میز پر آئے۔ فخر عالم کی رہنمائی میں جان عالم نے ایک کاٹا۔
 ایک بار اور تالیاں گونجیں۔

جان عالم نے سب سے پہلے ایک کا ایک پیس پلیٹ میں ڈال کر فخر عالم کو پیش کیا۔
 اور پھر۔۔۔ کئی ویٹر بیسیں تیزی سے وہی ایک ہر ٹیبل پر سرود کرنے لگیں۔

فخر عالم نے ایک کپ کوئی پر اکتفا کی۔ اور تمام مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے، پرویز کو وہیں رکنے کی تاکید کر کے جان عالم کے ساتھ باہر چل پڑے۔ انہیں ضروری کام نمٹانے تھے اور اس سے زیادہ وہ رک نہیں سکتے تھے۔
 ”او کے بچے enjoy yourself“۔ گینگ وے سے اترتے ہی وہ جان عالم سے بولے۔

جان عالم ان کے سینے سے لگ گیا۔ انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔
 ”بہ امان خدا“۔ وہ مزید بولے۔
 اور گاڑی میں جا بیٹھے۔
 جب تک گاڑی موڑ کاٹ کر نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ اور پھر اوپر لاؤنج میں آ گیا۔
 ”ماموں جان گئے؟“ چھوٹے ہی پرویز نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“

”تھینک کوڈ“۔ پرویز نے اوپر نظریں کرتے ہوئے جیسے نجات کی سانس لی۔
 اور جان خوش دلی سے ہنس دیا۔
 پھر۔ دونوں ویٹریس کی ہمراہی میں بار کی سمت کونے میں لگی میز کی طرف بڑھے۔

ویٹریس نے دونوں کے آگے کھانا لگایا۔
 آج کھانا لوازمات سے پر تھا۔ انواع و اقسام کا اور بے حد لذیذ۔
 ”شب پر آنے کی تمہیں کیا سوچھی؟“ پرویز روسٹ کا پیس منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”بس تھک گیا تھا۔ سوچا ذرا بریک بھی ہونی چاہئے۔“
 ”تو اس کے لئے تم نے“۔ اس نے آس پاس پر نظریں دوڑائیں۔ اور
 پھر جیسے نگاہیں ایک جگہ رک سی گئیں۔ ”تم نے یہ شب ہی چنا۔“

”کیوں؟ شب میں کیا ہرج ہے؟“ جان خوبصورتی سے ہنس دیا۔
 ”ہرج تو خیر نہیں۔“ اس کی نگاہیں واپس لوٹ آئیں۔ ”بس ذرا ست
 رفتاری کا احساس ہوتا ہے۔“

”مجھے بالکل نہیں ہوتا۔ لگتا ہے چھٹی لے کر گھر میں بیٹھا ہوں۔“
 ”ہاں — فلوئنگ گھر۔“ ایک بار پھر پرویز کی نظریں دور سامنے کی میز پر
 جا نکلیں۔

”مجھے واقعی اچھا لگ رہا ہے۔ سارا سارا دن آفس، دن میں کئی کئی میٹنگز۔
 مجھے لگتا تھا میں ایک مشین بن کر رہ گیا ہوں۔“
 ”ویسے — پرویز کا لہجہ کچھ رازدارانہ ہو گیا۔“ تمہارے اس چلتے پھرتے
 گھر میں رونق کافی ہے۔“

اور جان بات کی تہہ تک پہنچ کر خوبصورتی سے ہنس دیا۔
 ”بائے گوڈ — مشرقی حسن بہت دیکھا ہے — مگر — سامنے والی کی بات
 کسی میں نہیں دیکھی۔“ اس نے مزید کہا۔
 پرویز سامنے اور جان اس کے بائیں بیٹھا تھا۔ میز کوٹنے میں تھی اور پورا
 لاؤنج ویو میں۔

پرویز کی نظروں کی تعاقب میں جان نے بھی سامنے دیکھا۔
 جانے کیوں؟ ایک لمحہ کو جان جیسے ساکت سا رہ گیا۔
 ”کیا خیال ہے۔ میں نے ٹھیک کہا نا۔“
 ”ہوں — شاید۔“

”نہیں — شاید والی بات نہیں۔ پورے ہال پر نظر ڈالو — دنیا کے کئی
 ممالک کی لڑکیاں اور عورتیں موجود ہیں۔ کئی خوبصورت بھی ہیں — مگر — اس
 کو دیکھ کر تو خدا کی قدرت پر یقین پکا ہونے لگتا ہے۔“
 ”میں نے غور نہیں کیا۔“

”یہ مت کہو۔ اتنے دن سے اکٹھے سفر کر رہے ہو۔ وہ بھی شپ پر۔ جہاں ہر موڑ، ہر میڑھی، ہر سیٹ پر مڈ بھیڑ ہوتی ہے۔“

”اچھا کھانا کھاؤ۔“ وہ جیسے اس ذکر سے بے کل سا لگ رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔ یہ یقیناً پاکستانی ہے۔ صاف لگ بھی رہا ہے۔ اس لئے شاید تم۔ اوہ نو یار۔ اب اپنا نظریہ بدل بھی لو۔ ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی اور۔۔۔“ جان کا بدلتا رنگ دیکھ کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”اس کا نام۔۔۔ ناجیہ احمد ہے۔ اس کا باپ بھی پاکستان آرمی میں بریگیڈیئر ہے اور۔ اور۔ تم نے اس کے بال نہیں دیکھے۔ وہ بھی بہت لمبے ہیں۔“ جان کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

”اوہ۔۔۔“

پرویز جان کے الیے سے واقف تھا۔

اس کے باوجود۔۔۔ ماموں جان اور خود پرویز کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ شادی کرے اور پاکستان میں ہی۔ اپنے ملک کی مشرقی لڑکیاں یورپین ممالک کی لڑکیوں سے بہر حال اچھی تھیں۔ بقول ماموں جان اور پرویز کے، ہر عورت ایک سی نہیں تھی۔ اپنے ملک میں حیا اب بھی باقی تھی۔

لیکن۔۔۔ پرویز چند لحوں کو چپ سا رہ گیا۔

ناجیہ احمد پاکستان آرمی، بریگیڈیئر بہت لمبے بال۔

کتنی مماثلت تھی۔۔۔ دونوں میں!

مگر۔۔۔ ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ ایک بار پھر اس کے دل نے تردید کی۔

بہر حال۔۔۔ اس وقت اس نے مزید ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر مہمان ادھر ادھر چل دیئے۔ تو پورے لاؤنج کو اس طریقے سے ٹھیک کیا گیا۔ کہ درمیان والی جگہ ڈانس کے لئے اور اطراف پر کھڑکیوں کے پاس بیٹھنے کے لئے کرسیاں اور میزیں لگا دی گئیں۔

اس وقت تقریباً سبھی مہمان موجود تھے۔

کچھ کھڑکیوں کے قریب کرسیوں پر بیٹھے ڈانس پی رہے تھے، کچھ کوئی۔
کچھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تو کچھ ہال کے وسط میں ڈانس کرنے میں۔
مجتبیٰ مہ پارہ کے ساتھ محو رقص تھا۔ جان اسی فریج لڑکی کے ساتھ جسے ایک
بار ناجیہ نے ڈانس پر اس کے کندھے پر ٹھکے دیکھا تھا، خوبصورت سٹپس لے
رہا تھا۔

پرویز کھڑکی کے پاس بیٹھا اپنے ایک ہم پیشہ ڈاکٹر سے کپ شپ کر رہا تھا۔
آنٹی دور مخالف سمت میں اپنی معمر انگریز دوست مسز براؤن سے محو گفتگو تھیں۔
پرویز سے ایک میز کے فاصلے پر ناجیہ مسٹر اور مسز مارٹن کے ساتھ بیٹھی تھی۔
موسیقی کی دھنیں دم توڑ رہی تھیں۔ رقص کے جوڑے بدلے جا رہے تھے۔
مجتبیٰ نے بھی پارٹنر بدل دی تھی۔ مسٹر اور مسز مارٹن ڈانس کے لئے اٹھے تو
مہ پارہ وہیں آ کر بیٹھ گئی۔
”آؤ“۔

ناجیہ نے جھکی نظریں اٹھائیں۔

جان تھا۔ ہاتھ آگے بڑھایا تھا، اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے۔

چونک کر پرویز بھی اس طرف دیکھنے لگا۔

”ک... کس لئے؟“ ناجیہ حیرت سے بولی۔

”ڈانس کے لئے اور کس لئے؟“ وہ اسے ڈانس کے لئے کہہ رہا تھا۔ مگر لہجہ

سپاٹ اور چہرہ کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

”مجھے ڈانس کرنا نہیں آتا“۔ وہ سادگی سے بولی۔

اچانک ہی اس کے چہرے پر تاریک سائے لہرائے۔ آنکھوں میں وحشت

سی اتر آئی۔

”مجھے یہ خوف مت بناؤ“۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اسے زبردستی اٹھایا۔

”پاکستانی لڑکیاں کافی ایڈوائس ہیں۔ اور پھر۔“ اس کے لہجے میں بے پناہ تلخی تھی۔

”تمہارے تو نادربھی پاکستان آرمی میں ہیں وہ بھی بریگیڈیئر۔ ڈانس کیسے نہیں آتا۔“

اس کی گرفت اتنی سخت تھی۔ کہ وہ بلبلانٹھی۔

”پلیز۔“ ناجیہ کے لہجے میں التجا تھی۔ آنکھیں اس انہونی بات پر نم۔ ”میرے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے۔ کسی نے مجھے اس طرح آپ کے ساتھ دیکھ لیا۔ تو کیا سوچے گا۔“ اس کا اشارہ شاید آنٹی اور مجتبیٰ کی طرف تھا۔

”کسی کے دیکھ لینے کا اتنا ڈر ہے؟“ جان کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

اور۔ پرویز سے اور نہ رہا گیا۔ وہ تو پاگل پن کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ اٹھ کر قریب آ گیا۔

”کیا کر رہے ہو جان؟“ اس نے ناجیہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

اور۔ جان۔ تمام تر دشتوں کے باوجود خفیف سا نظر آنے لگا۔

”I'm sorry“

اور پھر۔ وہ دونوں کو وہیں چھوڑ کر بار کی طرف بڑھا۔

کافی دیر ہو گئی تھی۔ رقص کرنے والے جوڑے تھک چکے تھے۔ لاؤنج آہستہ

آہستہ خالی ہو رہا تھا۔ آنٹی اور مجتبیٰ بھی نیچے کیمیز میں جا چکے تھے۔

جان تب سے۔ سامنے سٹول پر بیٹھا، کاؤنٹر سے لگا دھسکی پی رہا تھا۔

”... کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ ہم سب کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی بھی اس کے

سامنے اس کی والدہ کا ذکر نہ کرے۔

وہ بہت خوبصورت تھیں۔ اُن کے بال بہت لمبے تھے۔ اُن کا نام بھی ناجیہ

احمد تھا۔ پاکستان میں اُن کے والد آرمی میں بریگیڈیئر تھے۔ تب ماموں جان

کیپٹن تھے آرمی میں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہوئے اور شادی ہو

گئی۔

ماموں جان نے اور طبیعت پائی تھی۔ آزادی کے خلاف نہیں تھے۔ انہیں
لم کر میس جاتے تھے، کلب جاتا تھا، سوشل کالو کر رہے تھے، مگر روز کے
اندر۔

بے حیائی سے انہیں چڑھتی۔ بے باکانہ انداز انہیں پسند نہ تھے۔ شادی سے
قبل ممانی کا ماحول خاصا آزاد قسم کا تھا۔ وہی اطوار شادی کے بعد بھی رہے۔
کلب میں دوسرے آفیسرز کے ساتھ ڈانس وغیرہ میں وہ عار نہ سمجھتی تھیں۔ ماموں
جان کا کبھی موڈ نہ ہوتا تو بھی وہ اپنا پروگرام کبھی مس نہیں کرتی تھیں۔ وہ بہت منہ
زور اور منہ پھٹ قسم کی تھیں۔ انہیں اپنے باپ کے بریگیڈیئر ہونے پر بڑا ناز
تھا۔ 'I'll shoot you' اُن کا تکیہ کلام تھا۔ ماموں جان کو جانے کیوں سب
گوارا تھا مگر نہیں تھا تو اُن کا ایک کیپٹن سے ہر بار ڈانس کرتا۔ اسی بات پر سختی اور
جھگڑے بھی ہونے لگے تھے۔

پھر جان پیدا ہوا۔ ماموں جان کا خیال تھا۔ عورت کی منزل مقصود انہیں مل گئی
ہے، اُن کی تکمیل ہو چکی ہے، اب معمول میں ضرور فرق آجائے گا۔ مگر۔ ایسا
نہ ہوا۔ جان آیاؤں کے رحم و کرم پر پلنے لگا۔

سال گزرتے جا رہے تھے۔ مگر اُن کے معمول میں بجائے کمی کے زیادتی ہی
ہو رہی تھی۔ گھر میں تلخیاں اور جھگڑے بڑھنے لگے تھے۔

جان پانچ سال کا ہو گیا تھا۔ ماموں جان میجر بن چکے تھے۔ ممانی اب رات
ایک ایک بجے گھر آنے لگی تھیں۔ ماموں جان کو اپنے ایک جگری دوست نے
وہ الفاظ میں ممانی کے اُسی کیپٹن سے جواب میجر بن چکا تھا، میل جول کا بتایا۔
اور جب ایک رات ماموں جان نے ممانی کے دیر سے آنے پر اُن سے باز پرس
کی۔ تو جھٹ انہوں نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

ماموں جان دم بخود رہ گئے۔ سب سے پہلا خیال انہیں جان کا آیا۔

”جان کا کیا ہوگا؟“ بستر میں جان کو سینے سے لپٹائے ماموں جان نے کہا۔
 ”یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔“

ماموں جان کے جیسے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔
 اتنے سالوں کی چپقلش کے بعد بھی وہ ممانی کو چاہتے تھے۔

جان پٹر پٹر ماں اور باپ کو دیکھ رہا تھا۔
 ”اس معصوم کی خاطر۔ کچھ تو خیال کرو۔“

”اس ایک معصوم کی خاطر اپنی تمام زندگی میں عذاب میں نہیں گزار سکتی۔“
 ایک بھی نظر جان کو دیکھے بغیر وہ لاپرواہی سے بولیں۔

ان کی جان سے کبھی Attachment ڈیولپ ہی نہیں ہوئی تھی۔ کبھی
 کبھار باہر سے واپس آ کر آیا سے اتنا ہی دریافت کیا تھا۔ کہ جان سو گیا؟ اور
 بس۔

اس نے دن کیسے گزارا؟ کچھ کھایا پیا؟ یہ جاننے کی انہیں نہ ضرورت تھی نہ
 فرصت۔

ماں کی ایک Embrace بچے کی شخصیت کو کن رفتوں و کن عظمتوں سے
 ہٹکار کرتی ہے۔ یہ انہیں معلوم نہیں تھا۔

بچے کی ایک مسکراہٹ ماں کو فردوس بریں پر لیجاتی ہے۔ یہ لطف ان کی
 قسمت میں نہیں تھا۔

یہ ابتداء تھی۔

پھر۔ ہم دونوں بڑے تھے۔

جان مجھے بتا رہا تھا۔

”اس رات کے بعد سے میں می سے بہت سہا سہا رہتا تھا۔ می نے اپنا کمرہ
 بابا جان سے الگ کر لیا تھا۔ بابا جان مجھے اپنے ساتھ ہی سلاتے۔ میں نے اکثر
 رات کو بابا جان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مجھے بابا جان سے اور بھی عقیدت ہو

گئی تھی۔

”آپ می کو اچھے نہیں لگتے؟“۔ ایک رات میں نے بابا جان سے پوچھا۔
وہ مسکرا دیئے۔ مجھے آج تک ان کی تلخ دکھی مسکراہٹ یاد ہے۔
”میں بھی اچھا نہیں لگتا ان کو“۔ میں رو دیا۔

بابا جان نے مجھے سینے سے لگا کر تھکیاں دے دے کر سلا دیا۔
ایک رات می نے پھر دہرایا۔
”مجھے طلاق چاہئے۔ فوراً“۔

اس بات کو ٹالتے ٹالتے بابا جان نے پورا ایک سال گزار دیا تھا۔ اب شاید
وہ بھی ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔
”ٹھیک ہے۔ میں کاغذات تیار کر لوں گا“۔
اور پھر۔ طلاق ہو گئی۔

می جانے لگیں۔ تو میں برآمدے کے پلر کے پیچھے چھپ کر پھوٹ پھوٹ
کر رو دیا۔ جتنی چیخ کر رونا چاہتا تھا مگر ان سے ڈر لگتا تھا۔
بابا جان انہیں خدا حافظ کہہ کر لوٹنے لگے۔ تو مجھ پر نظر پڑ گئی۔
گود میں لے کر گھر کے اندر آ گئے۔ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے
لیپے کتنی ہی دیر روتے رہے۔

رات ہوتے ہوتے مجھے بخار ہو گیا۔ می کو یاد کر کے میں روتا رہا۔
اگلے دو دن بھی میں بخار میں تڑپتا رہا۔
ڈاکٹر نے کہا گہرا صدمہ ہے۔

اور پھر تو۔۔۔ میں مسلسل بیمار رہا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔
بابا جان نے بیٹ من بھجوا کر لوکل ہوٹل میں مقیم می کو کھلا بھیجا۔
”ان سے کہنا جان بہت بیمار ہے تھوڑی دیر کو آ کر مل لیں“۔ وہ میرے
سرہانے بیٹھے میرا ماتھا سہلاتے ہوئے بولے۔

میں نے وہ چند گھنٹے امید و بیم میں دروازے پر نظریں جمائے گزار دیئے۔
 ”صاحب وہ کہتی ہیں وہ نہیں آئیں گی۔“ بیٹ مین نے آ کر کہا۔
 اور پتہ ہے۔ کیا ہوا؟ مجھے اچانک اپنے جسم میں طاقت محسوس ہوئی۔
 جیسے میں بیمار ہی نہیں ہوا تھا۔ بستر میں اٹھ بیٹھا۔ بابا جان کا سراپا اپنی بانہوں میں
 لے لیا۔

”بابا جان۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آئندہ کبھی مئی کو مت بلائیں۔ مجھے
 نفرت ہے ان سے۔“

اور تب سے۔ وہ آج تک ہر پاکستانی عورت سے نفرت کرتا ہے۔
 بعد میں ممائی نے اپنے اسی ڈانس پارٹنر۔ ماجر سے شادی کر لی۔
 ماموں جان مزید وہ ماحول برداشت نہ کر سکے۔ فوج سے ریٹائر کر کے اپنی
 تمام جائیداد بیچ کر جان کو ساتھ لے کر ہمیشہ کے لئے یہاں آ گئے۔ اور۔ پرویز
 جیسے تھک کر بولا ”تب سے جان یہیں ہے۔ اس کی نگہداشت کے لئے یہاں
 ماموں جان نے ایک بیوہ ایرانی آیا رکھ لی تھی۔ بہت نیک خاتون ہیں، جان کو
 اپنی اولاد کی طرح چاہتی ہیں۔۔۔“
 ”مجھے ایرانی ہمیشہ بہت اچھے لگے ہیں۔“ ناجیہ کو ڈیک پر مہ پارہ سے کبھی
 جان کی بات یاد آ گئی۔

”یہاں آنے کے بعد ماموں جان تو پھر چار پانچ سال بعد پاکستان کا چکر لگا
 آتے ہیں۔ مگر جان پھر کبھی وہاں نہیں گیا۔“

پاکستان اور پاکستانی عورتوں سے اسے شدید نفرت ہے۔
 اور۔ اور۔ آپ میں اور اس کی ماں میں بڑی مماثلت ہے۔
 ناجیہ احمد پاکستان آر می، بریگیڈیئر، بہت لمبے بال!“
 اس نے گہری سانس لی۔

”میں اور جان کزنز بھی ہیں دوست بھی۔ اتنا عرصہ ہم نے اکٹھا گزارا۔“

اس قدر وحشت میں آج پہلی بار میں نے اسے دیکھا ہے۔“

ناجیہ کی نظریں سامنے بار کی طرف اٹھیں۔ وہ سکی کا گلاس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

پرویز اٹھا۔ اور اسے سہارا دے کر آہستہ آہستہ کیبنوں کی طرف اترتی میٹھیوں کی جانب لے جانے لگا۔

نڈ حال سی۔ وہ بھی اٹھ کر نیچے آ گئی۔

کپڑے تبدیل کئے اور بستر پر لیٹ گئی۔

اسی کی شلوار، میض، دوپٹے اور بالوں پر نظریں دوڑاتے دوڑاتے اس کا چہرہ سایوں کی زد میں آ جاتا۔ آنکھوں میں تھیک اتر آتی۔

”اپنے حواس میں رہا کریں۔ یہ شپ ہے آپ کا گھر نہیں۔“ پہلے ہی دن اس نے بڑی حقارت سے کہا تھا۔

”From?“۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پاکستان ہی کی رہنے والی تھی اس نے بے حس سی مسکراہٹ سے پوچھا تھا۔

”پاکستان“۔ جب اس نے جواب میں کہا تھا تو اس کی آنکھوں میں کرب اتر آیا تھا۔ تمام شخصیت مجرد لگنے لگی تھی۔

”ہم مشرق کے رہنے والے ہیں وہاں حیا ہی لڑکی کا سب کچھ ہوتی ہے۔ اور۔۔۔ اس میں یہ بھی شامل ہے کہ مس احمد مجھ سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہیں کریں گی۔“ اس نے مشرق اور حیا پر تب بھی طنز کیا تھا۔ ساتھ ہی اسے اپنے ساتھ فری نہ ہونے کی تسمیہ کی تھی اس لئے کہ اس ناجیہ احمد کی وجہ سے وہ اس سے بھی خوفزدہ تھا۔

اس نے جب جب مجتبیٰ کو اسکے ساتھ دیکھا۔ لیوں پر طنز اور آنکھوں میں تھیک اتر آئی۔ اس کا مطلب تھا وہ اسے بھی ماضی کی ناجیہ احمد سے تعبیر کر رہا تھا۔

اس رات بھی وہ دیر تک پیتا رہا تھا۔

ابھی پرسوں ہی کوریڈور کا Swing door جب اس کے سر میں لگا تھا۔ تو لمحہ بھر کی پریشانی کے بعد وہ بالکل نارمل تھا۔ مگر — جوں ہی کوریڈور میں آ کر دیکھا کہ دروازہ ناجیہ نے ہی دھکیلا تھا۔ تو یکدم ہی اس کی آنکھوں میں وحشت چھا گئی تھی۔ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔

”آپ کو معلوم ہے Swing door میں شیشہ کیوں لگا ہوتا ہے۔“
وہ بے پناہ حقارت سے بولا تھا۔

”Mind your foot Ma'am“۔ کل ہی لنچ پر گھبراہٹ میں اس کے پاؤں سے اس کا پاؤں چھو جانے پر وہ اچانک تلخی سے بولا تھا۔ ”مجھ سے فری ہونے کی ضرورت نہیں۔“ ایک بار پھر اسے ناجیہ کے فری ہونے کا اندیشہ محسوس ہوا۔

”جی وہ پاکستان آرمی میں بریگیڈیئر ہیں۔“ مسٹر مارٹن کے ایک سوال پر آج صبح ناشتہ کی میز پر اس نے کہا تھا۔

جان نے اس بات پر ٹپ کر اسے دیکھا تھا۔
”رات تم نے یہ نہیں کہا کہ تم مجھے شوٹ کر دوں گی۔“ جان کا اشارہ یقیناً ماضی کی ناجیہ احمد کے نکلیہ کلام کی طرف تھا۔ ایک بریگیڈیئر کی بیٹی ہو کر تمہیں مجھے شوٹ کر دینے کی دم مکی دینی چاہئے تھی۔۔۔“

”Well I hate long hair.“۔ مسٹر مارٹن کی اس کے بالوں کی تعریف پر جیسے اسے اپنے اوپر قابو ہی نہ رہا تھا۔ اسے ہر اس چیز سے نفرت تھی جس میں اسے اپنی ماں کا عکس نظر آتا تھا۔

”لیکن وہ ایسا کبھی نہیں چاہیں گے۔“ ناجیہ کی اس کے بابا جان سے ملنے کی خواہش ظاہر کرنے پر وہ بیحد سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس میں ماضی کی ناجیہ احمد سے اس قدر مشابہ لڑکی کو اپنے بابا جان سے ملانے کی ہمت نہیں تھی۔

”پاکستانی لڑکیاں کافی ایڈوائس ہیں۔ اور پھر تمہارے تو فادر بھی پاکستان

آرمی میں ہیں وہ بھی بریگیڈیئر— ڈانس کیسے نہیں آتا۔“

پہلے کی تاجیہ احمد کے طور طریقوں کی وجہ سے اسے ہر پاکستانی لڑکی ایڈوانس لگتی تھی۔ پاکستان آرمی جیسے اس کی نظر میں ایڈوانسمنٹ کی علامت تھی۔ وہ تاجیہ احمد بریگیڈیئر کی بیٹی ڈانس میں ماہر تھی تو اس کے خیال میں یہ تاجیہ احمد جبکہ اس کا باپ بھی بریگیڈیئر تھا کیسے پیچھے رہ سکتی تھی؟

بستر پر پڑے پڑے وہ سوچوں کی یلغار سے برسرِ پیکا رہتی۔

بار بار جگہ جگہ اس کی توہین کرنے میں کس کا قصور تھا؟

اُس کا؟ یا اس عورت کا جس نے اسے جنم دے کر تنہائیوں اور لاتنتاہی دکھوں میں دھکیل دیا تھا۔ شکوک اور دوسوسوں کی بھیانک بھول بھلیوں میں جھونک دیا تھا۔ ایک پوری قوم سے متنفر کر دیا تھا۔

اس قوم کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے خلاف ذہن میں زہر بھرو دیا تھا۔

قوم— جو اس کی اپنی تھی، اس کی شناخت تھی۔

مائیں، بہنیں، بیٹیاں— جو اس کا حصہ تھیں، ذمہ داری تھیں۔

قصور کس کا تھا؟ ذمہ دار کون تھا؟

تاجیہ احمد، پاکستانی آرمی، بریگیڈیئر!

جانے کیوں؟ اسے خود بھی اس مماثلت سے نفرت سی ہو گئی۔

اور پھر— اس نے سوچا— وہ ہر ممکن کوشش کرے گی اس کا سامنا نہ کرنے

کی۔ اسے Irritate نہ کرنے کی۔

تمام حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اسے بے قصور— بلکہ مظلوم نظر آیا۔ خواہ مخواہ اس کے سامنے آ کر وہ اسے مزید دکھی نہیں کرے گی۔

شب پر پہلی رات بھی اس نے بہت پی تھی۔ عرصہ بعد ایک پاکستانی لڑکی کو دیکھ کر شدید دھچکا لگا تھا۔

اس کے بعد وقتاً فوقتاً وحشت چھا جاتی تھی۔ مگر اتنی نہیں جتنی آج رات تھی۔

آج بھی وہ دیر تک پتہ نہ پتا رہا تھا۔ ڈانس کے موقعہ پر شاید اسے کچھ تلخ یادوں نے
پھر شدت سے آن گھیرا تھا۔

پہلی رات بھی اس نے تقریباً تمام رات کروٹیں بدل کر گزاری تھی۔

اور آج۔ اس وقت پھر۔ کروٹوں پر کروٹیں لے رہا تھا۔

وہ دیکھی ہوئی تھی۔ اسے اپنا آپ مجرم سا لگنے لگا۔

آئندہ وہ حتی الامکان اس کے سامنے نہ آنے کی کوشش کرے گی۔

سوچتے ہی قدرے سکون کا احساس ہوا۔

رات آدمی تھی۔ شپ پر کھل سناٹا تھا۔

باہر دریا کا مخصوص شور تھا۔ چہروں کے شپ سے ٹکرانے کی آوازیں تھیں۔

کبھی کبھی ایک آدھ بارج پاس سے گزر جاتی، یا پھر کسی ہوٹل کی مختصر سی آواز سنائی
دے جاتی۔

وہ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔





اگلی صبح۔ اس نے سوچا ناشتے پر اس وقت جائے گی جب جان ناشتہ کر چکا ہو یا پھر اس کے میز پر جانے سے پہلے پہلے ہی کر آئے گی۔

مگر۔ شاید وہ اس کی میز پر آئے ہی نہ۔ پرویز کے ساتھ بار کے سرے والی کونے کی اپنی مخصوص میز پر ناشتہ کرے۔ اگر ایسا ہو تو بھی اسے احتیاط برتنی چاہئے۔

بھئی۔ جان کے کیمن میں برتنوں اور کٹری کا شور اٹھا۔ ساتھ ہی پرویز کے قہقہے۔ اور اس کی جان میں جان آ گئی۔

آئی، مجتبیٰ اور وہ اوپر لاؤنج میں ناشتہ کر رہے تھے کہ سٹیکرز پر کوریئر کا اعلان سنائی دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں بس آنے والی تھی جو پنجرز کو ٹرپ پر لے کر جانے والی

تھی۔ اس نے مہمانوں کو تیار رہنے کی تاکید کی تھی۔

کیمین میں آ کر اس نے سفید زمین پر چھوٹے چھوٹے نیلے پھولوں والے کپڑے پہنے۔ سفید شبنم کا دوپٹہ اور سفید ہی جوتی پہن لی۔ بالوں میں برش کر کے چوٹی بنا لی اور فریوم کی سپرے کر کے کیمین لاک کرتی آئی کی طرف آ گئی۔

بس میں آئی اپنی انگریز دوست مسز براؤن کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ مجتبیٰ مہ پارہ کے ساتھ تھا۔ اور ناجیہ ایک امریکن لڑکی کے ساتھ۔

کوچ چل پڑی تھی۔ وہ اپنی کھڑکی میں سے انکور کے باغوں سے لدی پہاڑیوں کو تک رہی تھی۔

گھنٹہ بھر میں وہ لوگ Mayschoss کے چھوٹے سے ٹاؤن میں پہنچ گئے۔ یہاں مکانات سفید اور چھتیں سرخ تھیں جگہ جگہ بالکنیوں میں، باغیچوں میں پھول ہی پھول کھلے نظر آ رہے تھے۔

اور—ہر طرف—پہاڑیوں کے ڈھلوانوں پر قطار در قطار لگے انکوروں کے باغ تھے۔

یہاں انہیں ایک Wine Cellar دکھائے جانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ بلڈنگ میں داخل ہو کر وہ لوگ Cellar کی طرف بڑھے۔

انہیں لمبی اور پتلی سرنگوں میں سے گزرنا پڑا۔ یہ سرنگ اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ سرنگوں کے دونوں طرف مختلف قد و قامت کے بیرل رکھے ہوئے تھے۔ کچھ اتنے بڑے کہ چھت تک پہنچتے تھے۔ کچھ چھوٹے جنہیں بیچ بیچ میں سمو یا گیا تھا۔

بتیاں ہلکی تھیں۔ چھت تقریباً کالے۔

سرنگ ایک بڑے تہہ خانے میں جا کر کھلا۔ تہہ خانے کی چھت لکڑی کے بیم کی بنی تھی اور ایک بڑا سا پیہہ نما فائوس تھا جس کے بلب پیہے کے ارد گرد لگے تھے۔

لمبی لمبی لکڑی کی میزیں اور کرسیاں لگی تھیں۔ سامنے ایک کاؤنٹر تھا جو بارک طور پر کام کرتا تھا۔

گائیڈ نے انہیں وہ مشینری بھی دکھائی جہاں شراب کو بوتلوں میں بند کیا جاتا تھا۔

اس نے انہیں اپنی سرخ شراب، جس کے لئے یہ وادی مشہور تھی، چکھنے کی دعوت دی۔

بار کے آگے قطار بن گئی۔

جو لوگ دائیں نہیں پینا چاہتے تھے ان کے لئے انگور کا جوس گلاسوں میں ڈال دیا گیا تھا۔

کیو میں آنٹی آگے تھیں اور ناجیہ ان کے پیچھے۔

معا اس کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی کھینچ سی گئی۔

تھوڑے بھلا کر وہ مڑی۔

اس کے بال کیو میں اس کے بالکل پیچھے کھڑے جان کی جیکٹ کی زپ میں الجھ گئے تھے۔

غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اس کی زپ پر گیا۔

اور—جان کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر۔

دانستہ یا نادانستہ؟ یہ وہ سمجھ نہ سکی۔

جان کے پرکشش ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

سٹون گرے آنکھوں میں نشیلی سی چمک تھی۔ یہ اس نے ضرور دیکھ لیا۔

اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔

جان نے آہستہ سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ اور اس کے بال اپنی زپ میں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

جتنی ناجیہ کو اس کے سامنے سے نکل جانے کی جلدی تھی۔ اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔

”افوہ۔“ ناجیہ نے بال کھینچنے چاہے۔

”اب کیا کیا جائے تمہارے بال جانا ہی نہیں چاہتے۔“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ ہاتھ اب بھی بالوں کو چھڑانے میں لگے تھے۔
اس کے کندھے پر سے جھانکتا پرویز مکھنکارا۔
”مسٹر جان فخر عالم! اب آگے بھی بڑھیں پیچھے قطار میں کھڑے لوگ بے صبر ہو رہے ہیں۔“

اور — ناجیہ سرخ ہوتے ہوئے اپنے بال ایک جھٹکے سے چھڑا کر آگے بڑھ گئی۔

جان — اپنی زپ میں پھنسنے بالوں کے چھوٹے سے کچھ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔
آنٹی اور ناجیہ نے انگوڑ کا جوس پی لیا۔ بیٹھا اور خوش ذائقہ۔
تہہ خانہ دیکھنے کے بعد وہ لوگ پھر سے کوچ میں بیٹھ گئے۔
اب وہ لوگ دیہاتوں میں سے گزر رہے تھے۔ ایک کے بعد دوسرا چھوٹے موٹے دیہات۔ پہاڑیوں پر کبھی کبھار ایک آدھ اونچا قلعہ بھی نظر آ جاتا۔
پھر — وہ ہوٹل آ گیا جہاں ان لوگوں کے لُچ کا بندوبست کیا گیا تھا۔
آنٹی اور مجتبیٰ کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا کھاتے کھاتے اس نے ارگرد سرسری نظریں دوڑائیں۔

دائیں طرف دو میزیں چھوڑ کر — پرویز اور جان بیٹھے تھے۔
اسے کچھ دیر قبل تہہ خانے میں اس کا اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا یاد آیا — ایسا اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ مگر — اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ؟ آنکھوں کی چمک؟
کیوں تھا ایسا؟

نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر اس کی نظریں اس طرف اٹھیں۔
اوہ — وہ تو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس کی نظروں میں پہلے دالی کوئی تلخی کوئی چہین نہیں تھی۔ بلکہ —
جیسے کچھ کہہ رہی تھیں — کیا؟

یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

لنچ کے بعد وہ لوگ باہر آ گئے۔

شام سے پہلے پہلے وہ لوگ Braubach پہنچ گئے۔

اوپر۔ بہت اوپر۔ اونچائی پر۔

Ancient castle of Markssurg واقع تھا۔

ڈھلان اس قدر سیدھی تھی کہ چڑھنا محال نظر آ رہا تھا۔

بس گولائیاں گھومتی سڑک پر چکر کاٹتی گئی۔ اور پھر ایک طرف قدرے کھلی جگہ

آ کر رک گئی۔ سب اتر گئے۔ اب انہوں نے پیدل آگے جانا تھا۔

پتھروں کی ادھنی فصیلوں میں گھرا صدیوں پرانا یہ قلعہ دہشت ناک لگ

رہا تھا۔ اوپر چھت پر کی دندانے دار چار دیواری اور برجیاں دیکھ کر اس دور کے

حکمرانوں کے دبدبے کا اندازہ ہوتا تھا۔

گائیڈ انہیں اوپر جاتی کئی نیچی سیڑھیوں پر سے لے جانے لگی۔ وہیں اس نے

بتایا۔ یہ سیڑھیاں خاص طور سے ان گھوڑوں کے لئے بنی تھیں جو اوپر توپ

خانے میں جاتے تھے۔

وہیں قلعہ میں Torture Chamber بھی تھا۔ اذیتیں پہنچانے

والے آلے اب بھی وہاں رکھے تھے۔

اسے جبر جبری سی آگئی۔ وہیں رک گئی۔

”آؤ نا۔“ جھپٹی نے کہا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”ڈر لگتا ہے۔“

اور۔ پاس سے ہی۔ ایک جاندار تھوہ بلند ہوا۔

مڑتے ہوئے اس نے دیکھا۔ جان تھا ہنستے ہوئے اب بھی اس کے خوفزدہ

چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

وہ خفیف سی ہو گئی۔

لوگ آگے بڑھ گئے۔ آئی اور وہ وہیں کھڑی رہیں۔

آخر میں گائیڈ انہیں پتلی چکر دار میٹھیوں پر سے اوپر ٹاپ پر لے آئی۔ یہاں ایروروم تھا۔ گائیڈ نے بتایا اور یائے رانین پر یہ واحد قلعہ تھا جس کو کوئی بھی فتح یا جاہ نہیں کر سکا تھا۔

اس نے قلعہ کی دندائے دار دیوار پر سے نیچے دیکھا۔

بہت نیچے رانین کا پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔

ریور ٹریفک اب بھی رواں دواں تھی۔ اونچے پہاڑوں پر سرسبز جنگلات تھے اور ارد گرد ڈھلوانوں پر تاحہ نظر انگوروں کے باغات۔

پہاڑوں پر، ڈھلوانوں پر چھوٹے بڑے مکانات بکھرے نظر آ رہے تھے۔ جگہ جگہ گرے جے بھی تھے۔ اور چٹانوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور بھی قلعے نظر آ رہے تھے۔ قلعہ سے اتر کر وہ لوگ ڈھلان اترے لگے۔ وہیں چھوٹی سی کینے میں دھاری دار چھتریوں کے نیچے بیٹھ کر آئی، مچھلی اور تاجیہ نے ڈرنک پی۔

اب پھر سب لوگ کوچ میں بیٹھنے لگے۔

وہ بھی کھڑکی کے قریب والی سیٹ پر بیٹھ گئی اس کے پاس والی سیٹ خالی تھی۔ کوریئر نے گنتی شروع کی تو جان بھی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے دیکھا جان اس کے پاس والی سیٹ کی طرف آ رہا تھا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کا کم سے کم سامنا کرنا چاہتی تھی۔

اور جانے کیوں؟ تاجیہ کا ارادہ بھانپ کر اس کے پرکشش چہرے پر سایہ سا لرزا تھا۔

سایہ۔ جو پہلے سایوں کے برعکس۔ کچھ اور نوعیت کا تھا۔

جیسے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ چلی جائے وہاں سے۔

کوئی توجہ دے۔ یہ بنا وہ پیچھے جا کر ایک یورپین خاتون کے پاس جا بیٹھی۔
ڈنر سے پہلے ہی وہ لوگ شپ پر پہنچ گئے۔

منہ ہاتھ دھو ہی رہی تھی کہ ڈرنیل ہو گئی۔ آج وہ آٹنی کی طرف بھی نہیں گئی۔
جلدی جلدی اوپر لاؤنج میں گئی۔ جان اکثر دیر سے کھانے پر آتا تھا۔ اس کی
میز پر جہاں ٹیبل پلان کے مطابق اسے ہونا چاہئے تھا یا دور بار کی طرف کونے
والی میز پر۔ آتا تو رے لیٹ ہی تھا۔

مسٹر اور مسز مارٹن بھی ابھی نہیں آئے تھے۔ وہ جلدی جلدی کھانا ختم کرنے
کی کوشش کرنے لگی۔ جان کے لاؤنج میں آنے سے قبل ہی وہ فارغ ہونا چاہتی
تھی۔

آخری نوالے لے ہی رہی تھی۔ کہ وہ آ گیا۔
”گڈ ایوننگ“۔ مسکراتے ہوئے وہ اپنی سپٹ پر بیٹھ گیا۔
اس کا ٹھکراٹھا۔

اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں شوخ چمک تھی۔ تھنی یا تھنیک نہیں تھی۔
اتھارٹی اور شوخی مل کر اس کی شخصیت کو مزید پرکشش بنا رہے تھے۔
کوئی جواب دیئے بنا۔ وہ ٹیکس سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔

اور۔ ایک بار پھر۔ خود کو یوں نظر انداز ہوتے دیکھ کر وہ مرجھا سا گیا۔

کرسی پیچھے کھسکاتے کھسکاتے تاجیہ کی نظریں ایک دفعہ پھر اس پر پڑیں۔

اس کی آنکھوں کی شوخی بھری اتھارٹی گھاسیل ہو چکی تھی۔

مذہب شخصیت مجرد نظر آ رہی تھی۔

کیا کرے؟ ایک ہل کو تاجیہ الجھ کر رہ گئی

سامنے ہوتی تھی تو وہ توہین کرنے پر اتر آتا تھا۔ سامنے سے جانے کا

سوچتی۔ تو اس سا لگنے لگتا تھا۔

وہ سامنے ہوتی تھی تو وہ اس کی توہین کرتا تھا۔ یہ تو راز اس کی سمجھ میں آ گیا

تھا۔

مگر۔ اس کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی تو وہ اس سالکنے لگتا تھا یہ معہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

آہستہ آہستہ چلتی وہ اوپر ڈیک پر آ گئی۔

اور بھی لوگ اوپر آنے لگے۔ کچھ باہر Braubach کی جھلک جھلک کرتی شام دیکھنے ٹاؤن کا پیدل چکر لگانے نکل گئے۔

آئی بھی اوپر آ گئیں۔ تبھی پرویز اوپر آ گیا۔
”ہیلوس احمد“۔ وہ پاس چلا آیا۔

”ہیلو“۔

”Braubach کی روشنیاں enjoy کر رہی ہیں“۔

”مجتنی بہت جلدی میں تھاؤنر کا بھی انتظار نہیں کیا۔ کہتا تھا باہر کھالے گا۔ تھوڑی دیر صبر کرتا تو ہم بھی ساتھ جاتے“۔ میرا تو خیر کیا ہے۔ ”آئی کہتی گئیں۔“ ٹرپ سے ہی بہت تھک گئی ہوں۔ مگر ناجیہ تو چلی جاتی۔ آخر بار بار تھوڑی آئیں گے یہاں۔“

”چلے میں گھمالاتا ہوں آپ دونوں کو“۔ پرویز نے پر خلوص پیش کش کی۔

”تم ہو آؤ ناجیہ۔ میں واقعی تھکی ہوئی ہوں“۔

”میں؟“ یورپین ہوتے ہوئے آئی بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ وہ شام کے وقت اکیلی کیسے پرویز کے ساتھ جاسکتی تھی۔

پرویز اس کی جھجک سمجھ گیا۔

”آئی آپ بھی ساتھ چلے۔ کمپنی جتنی بڑی ہو اتنا ہی مزہ آتا ہے۔“

اور۔ چاروٹا چار آئی بھی ساتھ ہو لیں۔

گلیاں تنگ تھیں اور عمارات ہاف نمبرڈ۔ تمام خوبصورت ٹاؤن پر گزری ہوئی صدیوں کی عظمت کی گہری چھاپ تھی۔ روشنیاں تیز اور میوزک موڈ رن تھی۔ اس

نے سوچا عمارات چاہے نہ بدلیں تہذیب بدلتی رہتی ہے۔
 تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہ لوگ واپس شپ پر آ گئے۔
 پرویز کا شکر یہ ادا کرتی وہ اپنے کیمین میں آ گئی۔
 رات کے کپڑے بدل کر وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی
 باہر اندھیرا تھا۔ کسی اور شپ کے قریب ہی لنگر انداز ہو جانے کی وجہ سے
 Braubach کی روشنیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔
 یوں ہی وہ باہر اندھیرے میں گھورنے لگی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا اس وقت میرے کیمین میں آ کر۔“
 قریبی کھڑکی میں سے اچانک جان کی آواز سنائی دی۔
 وہ ٹھٹھک سی گئی۔

”لیکن میں تم سے پیار کرتی ہوں۔“ یہ تو شاید۔۔۔ مہ پارہ کی آواز تھی۔
 ”اوہ۔۔۔ میں تمہیں صرف ایک دوست سمجھتا ہوں۔ اور پھر میرے شپ پر جو
 بھی پنجر آتا ہے اس کا خیال رکھنا اس کی مدد کرنا میری ڈیوٹی ہے۔ تم اس سے نالا
 مطلب نکال رہی ہو۔“

مہ پارہ کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔
 ”پلیز۔۔۔ اپنے کیمین میں جاؤ۔۔۔ بری بات ہے۔ رات ہو چکی ہے۔“
 وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔

سوچو میں ابھی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔
 پیہ نہیں آ گئے ان کی کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس وقت تو باقاعدہ جیسے لڑ رہی
 تھی مہ پارہ۔ اور جان سخت غصہ میں تیز تیز بول رہا تھا۔
 اسے ہنسی آ گئی۔ شروع میں تو بڑی گہری چھن رہی تھی۔ کبھی شپ پر۔۔۔
 ادھر گہری گپ شپ میں مشغول۔ کبھی ڈانس۔ کبھی کچم۔
 میرے شپ پر جو بھی پنجر آتا ہے اس کا خیال رکھنا، اس کی مدد کرنا میری

ڈیوٹی ہے۔ اوہ۔۔۔ وہ دیر سے مسکرا دی۔
 ڈیوٹی ہی ڈیوٹی میں ایر اینین نے اچھا پکڑ لیا تھا۔
 مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ اسے کچھ لطف بھی آیا۔
 ”تنہائی۔۔۔ اور مجھے تنہائی کی سخت ضرورت ہوتی ہے جب آپ میرے پاس
 ہوتے ہیں۔“ ایک دفعہ ڈیک پر مہ پارہ نے جان سے کہا تھا۔
 ”اوہ۔“

”آئیں نا۔“

”چلو۔“ وہ بولا تھا۔

کیا تب وہ اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا؟ ہونہ۔
 اور ہونہ کے ساتھ ہی ناجیہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب سی ہو گئی۔
 مہ پارہ نے جب ایسا کہا تھا۔ اس وقت بھی اسے اچھا نہیں لگا تھا۔
 اور۔۔۔ جب جان نے چلو کہا تھا۔ اس وقت بھی اسے برا سا لگا تھا۔
 اور اب۔۔۔ مہ پارہ کے جان کو آن گھیرنے اور جان کے پیچھا چھڑانے کے
 عمل پر اسے کچھ تسکین سی ہو رہی تھی۔
 کیا تھا یہ سب؟

کروٹ بدل کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ قریبی کیمین میں خاصہ ہنگامہ سا
 ہوا۔ اور پھر۔۔۔ زور سے دروازہ مارنے کی آواز آئی تھی۔

مہ پارہ شاید ہارمان کر جا چکی تھی
 نکیوں میں سردے کر وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔



آج پھر صبح ہی صبح شپ چل پڑا۔

آج بھی ناشتے پر وہ سب سے پہلے گئی اور جب گرے چیک شرٹ اور گرے
پینٹ میں نفاست سے ڈریس آپ ہوا جان لاؤنچ میں داخل ہوا۔ تو وہ ناشتہ ختم
کر کے اٹھ آئی۔

ڈائننگ ایریا میں بچوں بچ چھوڑے گئے راستے پر آنے لگی۔ تو جان بھی پہنچ
چکا تھا۔

”گڈ مورننگ“۔ اس کی دھیمی بھاری آواز ابھری۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظریں اوپر اٹھیں۔

”Trying to avoid me again?“۔ ایک بار پھر نظریں

گھائیل اور شخصیت مجروح لگ رہی تھی۔
 جانے کیوں؟ اس سے اس کی یہ کیفیت دیکھی نہ گئی۔
 مگر — وہ کیا کرے؟ کون سا طریقہ اختیار کرے جس سے یہ آدمی مطمئن ہو۔
 سکون پاسکے۔

کچھ بھی کہے بنا وہ وہاں سے چلی آئی۔ اوپر ڈیک پر۔
 وہی بارج، سیٹرز اور لائنج وغیرہ آ جا رہے تھے۔ وہ ریلنگ کا سہارا لے کر
 کھڑی ہو گئی۔

دریا کے دونوں کناروں پر گاؤں آباد تھے۔ گھروں کے پچھواڑے چھوٹے
 چھوٹے باغیچے تھے۔ جہاں سبزیاں لگی تھیں۔ ایک دو باغیچوں میں خاتون خانہ گھوم
 پھر رہی تھیں۔ پھر کارخانے تھے۔ تجارتی مراکز۔ جو دریا کے کنارے دور تک
 پہلے نظر آ رہے تھے۔ نزدیکی ڈھلانوں پر قطار در قطار نیچے سے لے کر لامحدود
 اونچائیوں تک پہنچے انگوروں کے باغ تھے۔ دور — سرسبز پہاڑ تھے۔ اس سے
 بھی دور۔ اس پار — اونچے پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں پر گاہے گاہے برجیاں،
 مینار، کلس اور قلعے صدیوں پہلے کی قدیم داستانیں سناتے دکھائی دے رہے تھے۔
 لوٹ کر اس کی نظریں پھر انگوروں پر آ گئیں۔

”رائین کا یہ حصہ انگوروں کے باغات کے لئے مشہور ہے۔“
 نزدیک کھڑا پرویز اس کی انگوروں میں دلچسپی بھانپ کر اسے بتانے لگا۔
 چونک کر اس نے رخ پرویز کی طرف کر لیا۔

”آپ کب آئے؟“

”کافی دیر سے یہاں کھڑا ہوں۔ نظر عنایت کا انتظار کر رہا تھا۔“ وہ
 مسکراتے ہوئے سادگی سے بولا۔

اور — تاجیہ نے دیکھا — وہی قدم پر فولڈنگ چیئر پر رخ انہی کی طرف
 کئے ماتھے پر کئی ٹمکن لئے جان نیم دراز تھا۔

یقیناً اس نے پرویز کی بات سن لی تھی۔ اسی کو گھور رہا تھا۔
پتہ نہیں کیوں؟ وہ کچھ شیشا سی گئی۔

پرویز کی سادگی سے کہی گئی بات کے لب و لہجے پر مسکراتا بھی بھول گئی۔
”میں نے انگور کے باغ پہلے کبھی نہیں دیکھے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اور یہاں اتنے بکھرے پڑے ہیں اتنے نزدیک اور اتنے زیادہ اقسام کے کہ آپ چاہیں تو پوری Thesis لکھ سکتی ہیں۔“
”اوہ۔“

جان اٹھ کر کیپٹن زبرج چلا گیا۔ تھوڑی دیر وہیں رہ کر واپس آ رہا تھا۔
”جان کچھ بے کل سا لگ رہا ہے۔“ پرویز جیسے تمام وقت اسے نوٹ کر
رہا تھا۔ ”سخت مجلس معلوم ہوتا ہے۔“

کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ اس کے لب و لہجے پر بے اختیار ہنس دی۔

”بس بس۔ اتنے خوبصورت دانت ہیں آپ کے تو۔ میں تو۔۔۔“

اور۔۔۔ جان کی تیز چبھتی نظریں پرویز پر پڑتی دیکھ کر۔ وہ آہستہ سے وہاں
سے چل دی۔ یوں بھی۔ وہ پاس آتا تو اس نے چلے ہی جانا تھا وہاں سے۔
اور جاتے جاتے اس نے محسوس کیا۔ اس کے وہاں سے چل پڑنے پر۔
جان کی نظروں کی کیفیت بدل گئی۔

اب وہاں خاموشی سی چھا گئی۔ اداس سی خاموشی۔

”بڑی تعریفیں ہو رہی تھیں۔“ جان کی آواز بھاری تھی، لہجہ گھمبیر سا۔

اور۔۔۔ پرویز بمشکل ہی ہنسی پر قابو پاسکا۔

”حدیث شریف ہے کہ کسی کی کوئی خوبی تمہیں نظر آ جائے تو اس کی تعریف
ضرور کرو۔“

اور نہ چاہتے ہوئے بھی جان خوبصورتی سے ہنس دیا۔

”حدیث تو ہے یا نہیں، تمہیں موقع ضرور مل گیا ہے۔“

”خوبصورتی کے ساتھ ساتھ وہ بہت اچھی لڑکی بھی ہے۔“
 ”ہاں۔۔۔ پارسائی کا لیبل لگا یا تو ہے۔“ اس کی بات میں بے پناہ طنز تھا۔
 جبکہ۔۔۔ جانے کیوں؟ اس کا لہجہ اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہے
 تھے۔

ضمیر جیسے چھ رہا تھا۔ دل ملامت کر رہا تھا۔
 وہ پارساتھی۔ لیبل نہیں لگا یا تھا۔ اسے یقین تھا۔
 وہ اچھی لڑکی تھی۔ اس کی حیا سے بوجھل پلکیں کئی بار اسے بتا چکی تھیں۔
 ”ایسا مت کہو جان۔“ پرویز کو جیسے سچ اچھا نہیں لگا۔
 ”ایک اچھے کیریئر کی لڑکی کے لئے ایسا کہنا مناسب نہیں۔ تمہیں پتہ ہے
 کیریئر پانے کے لئے ایک لڑکی کو کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کتنی تک و
 دو کرنی پڑتی ہے۔ کتنا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ روح تک تھک جاتی
 ہوگی۔ ایسے میں۔۔۔ اگر کوئی اس کی اتنی سنبھال کر رکھی ہوئی عزت کو۔۔۔ لیبل کہہ
 دے۔ تو ٹوٹ پھوٹ نہیں جائے گی اس کی تمام ہستی۔۔۔“

”اوہ۔۔۔“ جان جیسے بے حد نادام تھا۔ ”I'm really sorry“
 مگر پھر اسے پرویز کی اتنی حمایت بھی جیسے اچھی نہ لگی۔ ”مگر۔۔۔ تم کیوں
 اتنا سائیڈ لے رہے ہو۔“

پرویز نے چونک کر اسے دیکھا۔ اور پھر زور سے ہنس دیا۔
 اس کے چونکنے میں ہی کچھ تھا شاید۔ جان کھیا سا گیا۔
 تبھی لاؤڈ سپیکر پر کوریئر کی آواز گونجی۔ شب دریا کے ایک ایسے حصے میں
 پہنچے والا تھا۔ جہاں پانی میں چھپی چٹانیں تھیں۔ اور جہاں سے ایک پامیلٹ اپنی
 خاص مہارت کی روشنی میں ان لوگوں کو بحفاظت پار لے جانے آنے والا تھا۔
 آئی اور تاجیہ بھی اعلان سکراؤ پڑیک پر آگئیں۔

انہوں نے دور سے دیکھا۔ دریا کے بیچ ایک بہت بڑی چٹان ابھری ہوئی

تھی۔

”یہ Lorelei rock ہے۔ جتنی اوپر نظر آ رہی ہے اس سے کہیں زیادہ نیچے گہرائی میں بھی گئی ہے۔“ جان کیپٹن زبرج سے کچھ فاصلے پر کھڑا ایک انگریز خاتون کو بتا رہا تھا۔ ”یہاں تقریباً ہر قلعہ پر چٹان کے لئے کوئی نہ کوئی کہانی مشہور ہے۔ یہ کہانیاں کہاں تک درست ہیں اس کا کوئی خاص پتہ نہیں۔ بہر حال اس چٹان کے بارے میں بھی ایک کہانی ہے۔“ وہ خوبصورتی سے مسکرایا۔ ”آپ کوریئر کوسٹیں ابھی بتائے گی اس کہانی کے بارے میں۔“

آئی اور تاجیہ اسی سمت ریٹنگ کے پاس کھڑی سامنے چٹان کو دیکھ رہی تھیں۔ ”... کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ایک سائیرن اس چٹان پر بیٹھ کر اپنے بالوں میں سنٹکھی کرتے ہوئے اتنی مٹھاس سے گاتی تھی کہ کشتی ران چٹان کی طرف کھینچے چلے آتے تھے اور کرا کر غرق ہو جاتے تھے۔“ کوریئر پہلے ڈچ پھر جرمن اور آخر میں محتاط انگلش میں بولی۔

لنچ کے لئے جان پرویز کے ساتھ بار کی طرف کونے والی اپنی مخصوص میز پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا تاجیہ آئی تھی۔ دور سے ہی پہلے اپنی میز کو اور پھر اس کونے والی میز پر نظر ڈالی تھی۔ یہ تسلی کر کے کہ وہ وہیں کھا رہا ہے۔ مطمئن ہو کر اپنی میز کی طرف بڑھی تھی۔

وہ پھر چپ چاپ سا نظر آنے لگا۔ ڈانس والی شام کے بعد سے وہ اسے برابر نظر انداز کر رہی تھی۔ کچھ ٹھیک بھی تھا۔ وہ بھی تو ہمیشہ اسے طنز و تشبیہ سے ہی نوازتا تھا۔

لیکن۔۔۔ اگر وہ سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی تو وہ کیوں پریشان تھا؟ وہ کچھ الجھ سا گیا۔

”ہم لوگ Rudesheim پہنچ گئے ہیں۔“ ایک بار پھر کوریئر کی آواز ابھری۔ ”یہ خوبصورت وائین ٹاؤن اپنی لذیذ شراب کے لئے مشہور ہے۔“

اس کے علاوہ یہاں ابھی بھی ان کا سلو کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں اور وینز نے جو لیس سیزر کے دور حکومت میں بنائے تھے۔ یہاں چیئر لفٹس بھی ہیں۔ جن میں بیٹھ کر آپ اوپر جا کر جرمن نیشنل مومنٹ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ یادگار 1883ء میں جرمن ایمپائر کی Reestablishment کی نشاندہی کرتا ہے۔“

جہاز ساحل سے لگ چکا تھا۔

نہادھو کر اس نے گلابی اور سفید چیک والا سوٹ پہنا۔ گلابی شفون کا دوپٹہ لیا۔ گلابی ہی شوز پہنتے ہوئے وہ کیمین لاک کر کے باہر نکل آئی۔

سہ پہر ہو رہی تھی۔ وسیع آکاش پر اکا دکا سفید بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوا خشک تھی۔ موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔

بیڑھیوں کی لمبی قطار طے کر کے وہ آنٹی اور مجتبیٰ باقی مسافروں کے ہمراہ اوپر آ گئے۔

شب پر کے تقریباً سبھی پنجرز اس وقت یہاں موجود تھے۔ طرح طرح کی بولیاں سنائی دے رہی تھیں، دنیا کے مختلف ممالک کی۔ ہر طرف چہل پہل تھی، رونق تھی۔

پھر قطار بنی۔ دو، دو افراد لفٹ میں بیٹھنے لگے۔

آنٹی اپنی دوست مسز براؤن کے ساتھ لفٹ میں بیٹھنے لگیں۔

”بیٹے تم مجتبیٰ کے ساتھ آ جانا۔“ انہوں نے کچھ فاصلے پر کیو میں کھڑی تاجیہ

سے کہا۔

مجتبیٰ کہاں تھا؟ تاجیہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اپنے برابر میں نظر ڈالی۔ وہاں تو ایک یورپین آدمی کھڑا تھا۔ مایوس ہو کر اس نے لفٹ میں جانے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا۔ کیو میں سے نکل کر ایک طرف ہونے لگی۔

”آؤ“۔ اچانک پیچھے سے پرویز نے اسے پکارا۔

فوراً ہی قریبی لفٹ روکی اور اس کے کچھ سوچنے سمجھنے سے قبل ہی اسے ہاتھ

سے پکڑ کر جلدی سے بٹھالیا۔ خود بھی بیٹھا۔

”نانا“۔ اس نے کیو میں کھڑے پریشان سے جان کی طرف ہاتھ ہلایا۔
اور۔۔۔ جان کی نظریں دیکھ کر جانے کیوں ناجیہ خوفزدہ سی ہو گئی۔ جیسے کھلی
ممانعت تھی ان میں۔ جیسے کہہ رہا ہو اسے پرویز کے ساتھ اس کا بیٹھنا اچھا نہیں
لگا۔ کیوں؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”جلتا ہے“۔ لفٹ کے چلتے ہی پرویز خوش دلی سے ہنس دیا۔
تو کیا چند لمحوں قبل جان کی نظروں میں جو کچھ اس نے پڑھا تھا پرویز بھی سمجھ رہا
تھا؟

ناجیہ محتاط ہو کر سٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔
”اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ اسے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ جیلز ہے۔“
پرویز مزید بولا۔

وہ کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے نیچے دیکھنے لگی۔
وہی انگور کے باغوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ پہاڑ تھے دریا تھا۔ وہ لوگ کافی
اونچائی پر تھے۔ راین کی چمکتی دکتی ٹریفک رواں دواں نظر آ رہی تھی۔ سیٹ کی
چمتوں والے مکان چھوٹے اور سڑکوں پر چلتی کاریں اور بسیں کھلونوں جیسی لگ
رہی تھیں۔

خنک ہوا چل رہی تھی۔ پرندے ڈول ڈول جاتے تھے۔ اور۔۔۔ آس پاس
تیزی سے بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔

جرمن مونیو منٹ قریب آ گیا تھا۔ وہیں پاس ہی ٹرمینل تھا۔ وہ دونوں اتر
گئے۔

ساتھ ہی پچھلی چیئر لفٹ سے اُسی یورپین آدمی کے ساتھ۔ جو کیو میں ناجیہ
کے برابر کھڑا تھا۔ جان اُتر آیا۔
چپ چپ۔۔۔ خاموش خاموش سا۔

”مسٹر جلیس بھی پہنچ گیا۔“ پرویز ہنستے ہوئے بولا۔ ”یہاں آؤ ہم یہاں ہیں۔“ وہ جان سے مخاطب ہوا۔

جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ٹریٹل سے باہر گیا۔ ناجیہ اور پرویز بھی باہر کھلی جگہ میں نکل آئے۔

تھوڑی ہی دیر میں جان ڈرنک کی تین بوتلیں لئے ان کی طرف آ گیا۔ ایک پرویز کو پکڑائی۔

”لو“۔ دوسری اس نے ناجیہ کو تھما دی۔

اور — تیسری خود منہ سے لگالی۔

پرویز بوتل لے کر ٹھہلتا ہوا پنجرے کے جھوم میں شامل ہو گیا۔

ناجیہ بے کھلی نظر آنے لگی۔

جانے کیوں؟ دو دن سے اس کے سامنے نہیں آئی تھی تو اس وقت اکیلے میں اس کا سامنا ہی نہیں کر پار ہی تھی۔

”Let's see the Monument“۔ اس کی آواز میں اتنا تحکم

تھا۔

کہ وہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکی۔

دیرے دیرے جیسے ہٹا ٹانز ڈکری گئی ہو۔ اس کے پیچھے ہولی۔

”ذرا جلدی میم“۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔

اور — ناجیہ کے قدم تیز ہو گئے۔

چند قدموں پر ہی ایک اونچے ستون پر عظیم الشان بت ایسا دہ تھا۔ وہ دونوں

اس کے گرد دینی سیز جیوں پر اوپر چڑھ گئے۔

اطراف پر نظریں ڈالیں۔ وہی انگور کے باغ، ٹھانٹیں مارتا

رائین — رائین پر کی ٹریفک — اور —

”وہاں — وہ دیکھو — جہاں وہ سنیرز اور بارج نظر آ رہے ہیں نا تقریباً

”وہیں ہمارا شپ ہے۔“ جان نے دور ایک موڑ میں سے نظر آتی ٹریفک کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چپ چاپ اس طرف دیکھنے لگی۔

اس عرصہ میں اس نے صرف اس کے احکام کی تعمیل ہی کی تھی اور بس۔

منہ سے اب تک کچھ نہیں بولی تھی۔

وہاں سے نظریں ہٹا کر تاجیہ نے تیزی سے پھیلنے والوں پر نگاہ کی۔

اوپر آسمان پر — نیچے وادی پر — ہر جگہ بادلوں کا راج تھا۔

”تمہیں بادل اچھے لگتے ہیں؟“ جان نے اچانک سوال کر دیا۔

تاجیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کی پلکیں جھک گئیں۔ سردھیرے سے اثبات میں ہلا دیا۔

”بارش؟“

تاجیہ کی جھکی پلکیں انھیں۔

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ بارش کے سوال کے علاوہ بھی جیسے اس

کی آنکھیں کچھ پوچھ رہی تھیں۔ بڑی بے باکی سے بہت دلیری سے۔

وہ سر ہلا کر جواب دیتا بھی بھول گئی۔

جان — محظوظ سا نظر آنے لگا۔

”ہوں؟“

اور — تاجیہ نے جھکا سر اثبات میں ہلا دیا۔

”اور — طوفان؟“

تاجیہ نے جھکی پلکیں اٹھائیں۔

جان کی دلنشین آنکھوں میں طوفان پاتا تھے۔ ان کہی کہانیوں کے، ان سنی

داستانوں کے۔

بہہ جانے گی، ڈوب جائے گی۔ یہ تو اسے خبر نہ تھی۔

مگر — گھبرا ضرور گئی، بے تحاشہ — دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔
اور — پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

جان مسحور سا اسے دیکھتا رہا۔

”مسٹر جان فخر عالم“ — نیچے سے پرویز نے صدا لگائی۔

اور — جان جیسے ہوش کی دنیا میں آ گیا۔

”نیچے آؤ — واپس نہیں جانا کیا؟“

اور وہ دونوں نیچے آ گئے۔ جان بوتلیں واپس کرنے گیا۔

اور پرویز نے دوبارہ تاجیہ کو اچک لیا۔ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے سال پر اسے لئے لئے کھو منے لگا۔

جان نے واپس آ کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ وہ لوگ نہیں تھے۔
تبھی وہی فریج لڑکی کیترین، جو اس کی سالگرہ پر اس کی ڈانس پارٹنر بنی تھی،
اور جسے ایک بار تاجیہ نے کونے کی ٹیبل پر بیٹھے جان کے کندھے پر جھکے دیکھا تھا۔
اس کے پاس چلی آئی۔

”یہاں انگور کے باغات کی کثرت ہے“ — نیچے وادی میں بادلوں میں چھپے
باغات پر نظریں ڈالتے ہوئے وہ فریج زبان میں بولی۔
”ہاں“

”یہ سب ایک ہی قسم کے انگور ہیں یا...“
”نہیں — کئی قسمیں ہیں۔ بہترین شراب جو یہاں بنتی ہے وہ رائین کے
کنارے ہی واقع تین قسم کے انگوروں سے بنتی ہے“ — وہ بھی فریج زبان میں
بات کر رہا تھا۔

”یہ کائے کے قابل کب بنتے ہیں؟ ان سے شراب کس طرح بنتی ہے؟“
یہ ایسے سوال تھے جو رائین کے اس حصے پر آ کر انگوروں کے لامتناہی باغات
دیکھ کر اکثر پنجر زکیا کرتے تھے۔

اس کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ خاموش خاموش سا تھا۔ مگر — پھر بھی اس کا فرض تھا اسے بتانا، سمجھانا کہ وہ شپ اوز بھی تو تھا۔

”خزاں تک کاٹنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ کٹائی ایک قومی چھٹی کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور اکتوبر، نومبر میں انگو رکاٹ لئے جاتے ہیں۔ گریپ ٹز میں کرش کئے جاتے ہیں۔ اور پھر وائین پر۔ سسر میں نچوڑے جاتے ہیں۔ جس بیرلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اچھی طرح بند کیا جاتا ہے اور خیر ہونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد خیر شدہ مادے کو اور بہت سے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کے شراب بنتی ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔

معا اس کی نظر ٹریٹل کی طرف اٹھی۔ پرویز ناجیہ کے ساتھ اندر داخل ہو رہا تھا۔

”ایکسپوزی“۔ اس نے کیتھرین سے معذرت کی اور تیزی سے اس طرف بڑھا۔

”وہ فریج لڑکی تمہیں پوچھ رہی ہے۔“ اس نے نفیس کی طرف بڑھتے پرویز سے کہا۔

”مجھے؟“ وہ حیرانگی سے بولا۔

”ہاں۔“ اس کی آنکھوں میں شوخ چمک تھی۔ ”اسے انگوروں سے متعلق کچھ انفارمیشن چاہئیں۔“

”اور رائین کے پردادا ہونے کے بعد بھی تم اسے کچھ نہ بتا سکے۔“

”اوں ہوں۔“ اس نے خوبصورتی سے سرنفی میں ہلا دیا۔

”سمجھ لوں گا۔“ وہ باہر کی طرف بڑھنے لگا۔

اور — جان جلدی سے آنے والی لفٹ روک کر ناجیہ کو ہاتھ سے کھینچتے ہوئے اس میں جا بیٹھا۔

”تویہ بات تھی۔“ باہر نکلتے نکلتے پرویز بڑبڑایا۔

”نانا“۔ جان نے چلتے چلتے بالکل اسی انداز میں کہا۔ جس میں نیچے سے اوپر آتے ہوئے پرویز نے اسے کہا تھا۔
 تاجیہ اب۔ بہت کچھ سمجھ رہی تھی۔

پرویز کا جگہ جگہ اسے اچک لینا۔ جان کو ہی چڑانا ہوتا تھا۔
 اور۔ جان کا۔ اس کے بار بار قریب آنا؟ یہ بھی کچھ واضح ہوتا جا رہا تھا۔
 مگر۔ اس کی نفرتیں؟ پاکستان سے۔ پاکستانی لڑکی سے؟ کہیں وہ۔ کہیں وہ
 اس سے کوئی بدلہ تو نہیں لے رہا تھا۔ قریب آ کر۔ اسے خوبصورت باتوں
 میں الجھا الجھا کر؟

’نہیں‘۔ دل نے کہا۔ وہ بہت صاف گو۔ سیدھا سادھا تھا۔
 ناپسندیدگی، پسندیدگی۔ کسی بھی جذبے کو چھپا نہیں سکتا تھا۔
 اس کا چہرہ ہر کہانی کہہ ڈالتا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر راز بتا دیا کرتی تھیں۔
 پرلی طرف کھسک کر۔ وہ سمٹ کر بیٹھی۔ باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 جان بھی۔ ارد گرد۔ اطراف پر نظریں دوڑا رہا تھا۔
 فضاؤں میں سکوت تھا۔ سرسراتی خشک ہواؤں میں سبزے اور نمی کی رچتی بسی
 مہک تھی۔ اور۔ نم آلود بادل ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لئے تھے۔
 نیچے وادی پر کے باغات لطف کے ارد گرد، ہر جگہ ہر سو بادل ہی بادل تھے۔
 رخ اندر کی طرف کر کے اس نے تاجیہ کو دیکھا۔ اپنے اور اس کے درمیان
 احتیاطاً چھوڑے گئے فاصلے، اس کے سمٹے ہوئے جسم اور شرمائے گھبرائے انداز
 پر نظر ڈالی۔

ایک مدھری مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ابھر آئی۔
 ”جسمیں چیز لفت میں ڈرتو نہیں لگتا۔“
 تاجیہ نے رخ اس کی طرف کئے بغیر ہی سرنفی میں ہلا دیا۔
 ”بڑی بولڈ ہو۔ میں نے تو اکثر بہت بھاری بھر کم خواتین کو گھبراتے دیکھا ہے۔“

وہ اسی طرح باہر دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں — وہ تو ویسے ہی اس کی قربت سے گھبرائی جا رہی تھی۔ بات کیا کرتی؟

”یہ — یہ — پرویز تمہیں کیوں لفٹ میں اوپر لایا تھا؟“

”اور — رخ باہر ہی کئے — وہ چپکے سے مسکرا دی۔

پرویز اگر اوپر لے کر آیا تھا — تو وہ بھی تو — واپس لے کر جا رہا تھا۔
اپنا حق شاید اسے جائز لگتا تھا۔

وہ اب بھی سائیڈ پر دیکھ رہی تھی۔ بولی کچھ نہیں — کہتی بھی کیا؟

جان نے ایک نظر پھر اس سے سٹے سٹائے سر اپے پر ڈالی۔

اس نے جتنا بے پناہ حسن پایا تھا۔ اسی کثرت سے شرم و حیا سے مالا مال تھی۔

اتنی دیر سے وہ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ باتیں کر رہا تھا۔

مگر وہ مارے حیا کے بول بھی نہ پارہی تھی۔

وہ اکثر سنتا تھا پاکستانی لڑکیاں ایڈوائس ہو رہی ہیں۔ پردے کے ساتھ

ساتھ بہتوں نے حیا بھی ترک کر دی ہے مردوں سے بلا جھجک گفتگو کرتی

ہیں۔ بوائے فرینڈز بھی رکھنے لگی ہیں۔ مالدار اور گلیمرس لڑکوں کے آگے پیچھے

رہتی ہیں۔

اور پھر اس نے خود بھی دیکھا تھا۔ انگلینڈ میں کئی پاکستانی خاندان ایسے تھے

جہاں لڑکیاں ان ساری باتوں کی تصدیق کرتی تھیں۔ جیتا جاگتا ثبوت تھیں۔

پھر — یہ — یہ کس کلاس میں آتی تھی؟

”اس کے گھر کا ماحول بہت صاف ستھرا اور سادہ قسم کا ہے۔ اس کا زیادہ تر

وقت ماں باپ کے پاس ہی گزرتا ہے۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ بس گھر سے کالج اور

کالج سے پھر گھر۔ یہی اس کی کل مصروفیات ہیں۔ باہر کی دنیا سے کوئی واقفیت

نہیں ...“ کل ہی پرویز اسے بتا رہا تھا۔

”بہت اچھے لگتے ہیں۔ بالکل بھائی کی طرح۔“ ایک بارڈیک پر ناجیہ نے

اپنے ساتھی لڑکے مجتبیٰ سے کہا تھا۔ گو اس نے دو ایک بار مجتبیٰ کو ناجیہ کی طرف مائل بھی دیکھا تھا۔ مگر کوئی حوصلہ افزائی نہ پا کر آج کل سچ مچ بھائی کی طرح پیش آ رہا تھا۔

پرویز کے ساتھ — یہاں بھی اسے کوئی قابل گرفت بات نظر نہ آئی تھی۔ نہ پرویز کی نظروں میں کوئی غلط بات نوٹ کی تھی اس نے۔ نا ہی ناجیہ کبھی خود سے اس کے پاس گئی تھی۔

پرویز اسے اچک لیتا تھا۔ اکثر جان کی نظروں کے سامنے ہی — شاید چڑاتا تھا اس کو۔

مگر — کیوں؟ — اور وہ — چڑ بھی جاتا تھا — ایسا کیوں تھا؟ اور پھر — اسے خیال آیا — پچھلے چند دنوں میں اس نے ناجیہ کو کتنا پریشان کیا تھا۔ توہین کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔

شب پر پہلی بار پاسپورٹس کی چینگ ہوئی تھی۔ تو اسے پتہ چلا تھا۔ کہ وہ کون تھی؟ کہاں کی رہنے والی تھی؟ تب ہی سے اس کے خلاف اس کے دل میں لاوا جمع ہو گیا تھا۔

اور پھر — جوں ہی وہ اسے پہلی بار نظر آئی۔ لاؤنج میں۔ ٹرے ہاتھ میں لئے۔ لاوا اکھولنے لگا۔

اور جب — اس کے ساتھ مگر لگنے میں ڈربک چھلک کر اس کے کوٹ پر آ رہی۔ تو لاوا بہہ نکلا۔

”اپنے حواس میں رہا کریں۔ یہ شب ہے آپ کا گھر نہیں۔“

وہ بولا تھا۔ اور —

”I am very sorry.“ — جب اس نے سہم کر کہا تھا تو اسے اور بھی آگ لگ گئی تھی۔

پاکستانی لڑکی اور سہم جانے؟ مظلوم بننے کی کوشش کرے؟

یہ اس کی سمجھ سے بالا تر تھا۔

مگر پھر — آہستہ آہستہ — جوں جوں —

وہ اس کے قریب آتا گیا۔ گو بہت ڈر ڈر کے —

بلکہ جیسے کھینچ کر چلا آتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔

تو دھیرے دھیرے اسے لگا۔ ہر لڑکی ایک جیسی نہیں ہوتی۔

ناہی کوئی خاص ملک کسی خاص کیریئر کے لئے مخصوص ہو سکتا ہے۔

جہاں پاکستان کی بعض لڑکیاں 'حیا' کو بار سمجھتی ہیں۔ وہاں کئی یورپین لڑکیاں

اس زیور سے آراستہ ہیں۔ جہاں چند پاکستانی لڑکیاں بے جا آزادی کی دلداد دے

ہیں۔ وہاں یورپ کی بیشتر لڑکیاں اس عذاب سے نالاں ہیں۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اب بھی اس کے بے تحاشہ لمبے بالوں پر

نظریں جمائے تھا۔

کتنا خوف آتا تھا اسے چند روز قبل اس کے ان لمبے بالوں سے۔ گھبرا جاتا

تھا اس کے کھلے بھیکے بالوں کو دیکھ کر۔

اور پھر — ایک اور بھی کیفیت تھی۔ جتنا جتنا وہ سامنے نظر آتی تھی۔ اتنا ہی

وہ خوفزدہ ہونے لگتا تھا۔ اس کے ذہن پر چھانہ جائے۔ شاید اس ڈر سے۔

تبھی تو اس نے اسے اس کے ساتھ فری ہونے سے منع کیا تھا۔

اسے اندیشہ تھا۔ وہ اور قریب آئی تو وہ ہتھیار ڈال دے گا۔

اور پھر — ناچہ نے کنارہ کرنا چاہا۔ اسے نظر انداز کرنا چاہا۔ کم نظر آنے لگی

بات کرنے کا موقع نہ ملنے لگا۔

تو — وہ — جیسے چونک اٹھا۔

وہ تو — شاید واقعی — اس کے ذہن پر چھا گئی تھی۔

اس نے تو شاید — سچ سچ ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

وہ اسے نظر انداز کر کے نکل جاتی۔ تو وہ اداس سا ہو جاتا تھا۔

اور پھر۔ غیر ارادی طور پر۔ اس کی نظریں اسے ڈھونڈتی سی رہتی تھیں۔

پرویز کو اس سے باتیں کرتے دیکھتا تھا۔ تو بے کل سا ہو جاتا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اسے چیئر لفٹ پر بٹھا کر اوپر لے گیا تھا۔ اسے اپنا

آپ خالی خالی سا لگنے لگا تھا۔

اور اب۔ اس وقت، ایک ہی چیئر لفٹ میں۔ اس کے پاس بیٹھی تھی۔

تو وہ۔ خوش تھا۔ مطمئن تھا۔

یہ سب کیا تھا؟ اتنی بہت ساری جپہن، بے چینی۔ خوشی اور اطمینان کے
مرحلوں سے وہ زندگی میں پہلی بار ایک ساتھ گزرا تھا۔

ہوا کے جھونکوں سے ناجیہ کے بال بکھر رہے تھے۔ وہ دنیا و ما فیہا سے
بے خبر۔ باہر جھانک رہی تھی۔

معا جان کی آنکھوں میں شوخی اتر آئی۔

لبوں پر شریر تبسم ناچ اٹھا۔

چیئر لفٹ کو اچانک جھٹکا لگا۔

ایک گھبرائی ہوئی چیخ کے ساتھ ناجیہ پلٹی۔ اور بدحواسی اور گھبراہٹ میں۔

بے اختیار جان کا بازو تھام لیا۔

لفٹ اپنی نارمل حالت پر آگئی تھی۔ ہموار اور متوازن ہو چکی تھی۔

ناجیہ کا خوف قدرے کم ہوا۔ جان میں جان آئی۔

تو اسے احساس ہوا۔ وہ اب بھی اس کا بازو اسی سختی سے پکڑے تھی۔

اور۔ جان۔ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی شوخی تیز اور

لبوں پر کا شریر تبسم گہرا ہو گیا تھا۔

”کب تک Avoid کرو گی؟“ اس کا لہجہ بھی معنی خیز تھا۔

تاب نہ لاتے ہوئے اس نے جلدی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

دوبارہ پرلی سمت کھسک گئی۔

کچھ دیر قبل کے جان کی آنکھوں میں چھائے طوفانوں کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔

ان کہی کہانیاں عنوان پانے لگی تھیں۔ ان سنی داستانیں سنائی دینے لگی تھیں۔
 ”مجھے یقین ہے یہاں کوئی تیسرا بندہ موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے میں تم ہی سے پوچھ رہا ہوں۔“

اور — ناجیہ کو لگا اب وہ اس کا سامنا نہ کر پائے گی۔
 سرخ تپتا چہرہ لئے باہر ہی دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔
 ”بولنا نہیں آتا؟“

اور — باہر ہی رخ کئے ناجیہ نے بمشکل سرنفی میں ہلا دیا۔
 وہ مسکور سانس دیا۔

”جہیں پتہ ہے وہاں سے لے کر“ اس نے دور اوپر بادلوں میں چھپے یادگار کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہاں تک تم نے کوئی بات نہیں کی۔“
 وہ دیر سے مسکرا دی۔ مڑ کر اسے اب بھی نہیں دیکھا۔
 اور — جان نے — ایک گہری سانس لی۔
 اطراف پر نظریں دوڑانے لگا۔ جلد ہی اکتا گیا۔
 ”اے ادھر دیکھو“۔ وہ پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔
 بے اختیار ناجیہ نے رخ اس کی طرف کر لیا۔

مگر — اس کی بہت کچھ بولتی آنکھیں دیکھ کر — جلدی سے رخ سامنے کر لیا۔

”دیکھو نا۔“

ناجیہ نے سرنفی میں ہلا دیا۔

”پھر وہی — بولو ورنہ — لفٹ گئی“۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں لفٹ پکڑ

لی۔

اور — حیرت سے پہیلی آنکھوں سے وہ اسے دیکھنے لگی۔
 تو ابھی کچھ دیر قبل لفٹ کو جھٹکا اس نے جان بوجھ کر دیا تھا۔
 اور — اس کا سوال سمجھتے ہوئے جان نے — اپنی گھنی پلکوں کو خوبصورتی
 سے اثبات میں جنبش دیتے ہوئے اقرار کر لیا۔
 لفٹ ڈولی تھی — تبھی تو اس نے بدحواس ہو کر اس کا بازو پکڑا تھا۔
 کتنا اچھا لگا تھا اسے یہ سب — وہ مسکور سا اسے دیکھ رہا تھا۔
 اور — اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ پھر پلکیں جھپکانے لگی۔
 لوگ باری باری لفٹ سے اتر رہے تھے۔ وہ دونوں بھی اتر آئے۔
 دور ناجیہ نے دیکھا۔ آنٹی اکیلی ہی کیفے کی ایک میز پر دھاری دار چھتری
 کے نیچے بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ جان کو چھوڑ کر وہ انہی کی طرف بڑھی۔
 آنٹی نے اس کے لئے آکس کریم منگوالی۔
 ”مجبتی بھائی نظر نہیں آئے“۔ آکس کریم کھاتے ہوئے اس نے آنٹی سے
 پوچھا۔

”مہ پارہ کے ساتھ لفٹ پر گیا تھا۔“

ناجیہ دھیرے سے مسکرا دی۔ رات جان سے جھگڑے کے بعد شاید مہ پارہ
 نے دھیان مجبتی پر لگا دیا تھا۔

”مجبتی کہتا ہے۔ یہ لڑکی لنڈن میں ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ رہائش پذیر
 ہے۔ اس کا گھر بھی ہم لوگوں کے پاس ہی ہے۔ کئی سال یہ پاکستان میں بھی رہی
 ہے۔ باپ وہاں ایران ایمبسی میں تھا۔ اسے پشتو اور اردو زبانیں بھی
 آتی ہیں...“

”اچھا“۔ ناجیہ کو اس اتفاق پر حیرت سی ہوئی۔

تھک تھکا کر سب لوگ واپس شپ پر آ گئے۔

قدرے تازہ دم ہو کر مجبتی تو مہ پارہ کو ساتھ لیکر Rudeshiem کی شام

کھونے باہر نکل گیا۔ آنٹی اپنے کیمین میں آرام کرنے لگیں۔

اور تاجیہ — منہ ہاتھ دھو کر بالوں پر سرسری برش کرتے ہوئے اوپڑیک پر آ گئی۔

”یہ یورپ کا مین واٹر وے ہے“۔ سامنے ہی پانیوں پر نظریں جمائے جان مسٹر اور مسز مارٹن کو بتا رہا تھا۔ ”تقریباً بیس ہزار جہاز اس پر مسلسل چلتے رہتے ہیں۔“

”آپ کا کیپٹن اور عملہ اپنے کام میں کافی ماہر معلوم ہوتا ہے“۔ مسٹر مارٹن نے کہا۔ ”ارد گرد کئی کئی کشتیوں اور جہازوں میں سے بچتا بچاتا آپ کا شپ آگے بڑھتا رہتا ہے۔“

جان مسکرادیا۔

”پانی میں رہتے ہوئے یہ لوگ اتنے ماہر ہو جاتے ہیں اور پھر سالہا سال کا تجربہ انہیں اتنا کچھ سکھا دیتا ہے۔ کہ جن باتوں پر آپ حیرت ہوتی ہے انہیں بالکل معمولی نظر آتی ہیں۔“

”یہ جو شپ پر مختلف جھنڈیاں نظر آ رہی ہیں ان کا بھی استعمال ہوتا ہوگا۔“

اب کے مسز مارٹن بولیں۔

”ضرور ہوتا ہے۔ انہی کے ذریعے تو شپ اوور فیک کرتا ہے۔ انہی کی موجودگی اور غیر موجودگی شپ کے دائیں اور بائیں گزرنے کا اشارہ دیتی ہے۔۔۔“

ڈنریٹیل ہوئی۔ تو سب نیچے لاؤنج کی طرف بڑھے۔

کیپٹن زبرج کے اس پار کھڑی وہ ڈنر پردیر سے جانے کا سوچ رہی تھی۔

اس سے قبل تو وہ جان کا سامنا ہی نہیں کرتا چاہتی تھی کہ وہ چڑے نہ۔ اس کی پرانی یادیں تازہ نہ ہوں۔

مگر آج۔ اس وقت تو۔۔۔ گرچہ جان کی اب وہ کیفیت نہ رہی تھی۔ اسے

دیکھ کر وہ حسب سابق چڑتا نہیں تھا۔

پرانی یادیں جیسے جھنک لی تھیں ذہن سے — یا پھر سمجھوتہ کر لیا تھا۔

لیکن آج — وہ چاہتی بھی تو اس کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

چیر لفٹس کی تمام ٹرپ میں — جان نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اتنا کچھ بتا دیا تھا۔ اور پھر — لفٹ ڈمگائی تھی تو اس نے بدحواسی میں جان کا بازو پکڑ لیا تھا۔ اس کی سراسیمگی سے وہ لطف اندوز بھی ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کی خوشی اور لبوں پر کا تبسم بتا رہے تھے۔

”کب تک Avoid کرو گی؟“ بدحواس ہو کر اس کا بازو پکڑنے پر اس کے لہجے میں لطیف چوٹ نمایاں تھی۔ نہیں۔ کم از کم اس وقت وہ اپنے میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہی تھی۔

ملگبسا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

سامنے ٹاؤن کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔

ہوا اچانک تیز ہو گئی تھی۔ اور آسمان پر گہرے بادل چھٹنے لگے تھے۔

پانی کی لہروں کو شپ سے ٹکراتے دیکھتی وہ رینگ پر جھک آئی تھی۔

”میں نے ڈنر کر لیا ہے“۔ جان تھا — بالکل پاس سے بولا تھا۔ ”اب تم کر

لو جا کر“۔

وہ اس کی سہمی سہمی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

لبوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

تو وہ — سمجھ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ڈنر پر نہیں گئی تھی۔

جان چکا تھا کہ وہ — اس کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی۔

اس کی پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

”میں واقعی کھا چکا ہوں۔ نہیں آؤں گا“۔ جیسے اس وقت وہ بھی سمجھ رہا تھا

کہ سمجھنے والوں کے برعکس آج، اس وقت وہ محض اس کی آنکھوں کے پیغام پڑھ کر

اس کا سامنا نہ کر پا رہی تھی۔ اسے نظر انداز کرنا مقصد نہیں تھا۔

کیا کہے؟ کیسے کہے؟

وہ دوپٹہ انگلی پر لپیٹ لپیٹ کر کھول رہی تھی۔ سینڈل کی ٹو سے وحات کے ڈیک پر لکیریں بن رہی تھی۔

وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا، اپنائیت سے۔

”تم تو بولنا ہی بھول گئی ہو“۔ پھر جیسے اسے اس کی سراسمکی پر ترس آ گیا۔

”اچھا میں چلتا ہوں۔ ٹاؤن تک، ایک ضروری فون کرتا ہے۔“ وہ ڈیک پر سے نیچے لیڈنگ سٹیج تک جاتی گینگ دے کی طرف بڑھا۔ ”تم جا کر کھانا کھا لیتا“۔

اور۔۔۔ تاجیہ نے نجات کی سانس لی۔

تھوڑی دیر اسے گینگ دے کی ڈھلان پر نیچے جاتا دیکھتی رہی۔

پھر مڑ کر دھیرے دھیرے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ کئی کروٹیں بدلیں۔ مگر بے سود۔

”باپ رہے“۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ گڑ بڑایا تھا۔ ”ڈوب

جاؤں گا۔ بند باندھ لوں گا۔“

”میں کوشش کروں گا۔ آئندہ تمہیں hurt نہیں کروں گا۔“

”تم ڈر پر نہیں آئیں“۔

”ہوں۔ کیوں نہیں آئیں؟“

گزرے ہوئے دنوں کی باتیں اسے ایک ایک کر کے یاد آ رہی تھیں۔ تب

بھی اس کی ذمہ داری باتیں اسے گڑ بڑا دیتی تھیں۔

”تمہیں بادل اچھے لگتے ہیں؟ بارش؟ اور۔۔۔ طوفان؟“ آج ہی وہ

آنکھوں میں سینکڑوں طوفان لئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ پرویز تمہیں کیوں لفٹ میں اوپر لایا تھا؟“

سوچتے ہی وہ بے ساختہ ہنس دی۔

”کب تک Avoid کرو گی؟“ بدحواسی میں اس کا بازو پکڑنے کی طرف اس کا اشارہ یاد آتے ہی اسے اب بھی اپنا رنگ سرخ ہوتا محسوس ہوا۔
 ”میں واقعی کھا چکا ہوں۔ نہیں آؤں گا۔“ وہ اس کا سامنا نہ کر پار ہی تھی وہ صاف سمجھ رہا تھا۔

”تم تو بولنا ہی بھول گئی ہو۔“ اسے شرم آ رہی تھی اس نے محسوس کر لیا تھا۔
 ”اچھا میں چلتا ہوں۔ ٹاؤن تک، ایک ضروری فون کرنا ہے تم جا کر کھانا کھا لیتا۔“ وہ بالکل یوں بولا تھا۔ جیسے وہ اس کی کوئی اپنی ہو۔
 ہر بات، ہر سین اس کی نظروں کے سامنے آ جا رہے تھے۔
 تھک کر اس نے پھر کروٹ بدلی۔ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

※—※



آج وہ پھر جلدی جلدی تیار ہوئی۔ چوکیٹ سوٹ، ہمرنگ دوپٹہ لیا۔ بالوں میں برش کر کے ڈھیلی سی چوٹی بنائی۔ اور۔۔۔ تیزی سے کوریڈور طے کرتی اوپر لاؤنج میں آگئی۔

Pakistanipoint

مبادا دیر ہو جانے پر جان بھی ماسٹر کی میز پر پہنچ جائے۔

مسٹر اور مسز مارشن البتہ پہلے سے بیٹھے تھے۔ میں مصروف تھی۔

”گڈ مورننگ“۔ بیٹھتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

”گڈ مورننگ۔ آج کل بہت سویرے آ جاتی ہونا مٹھے پر مس احمد۔ جبکہ میں

اس عمر میں اتنی جلدی کبھی نہیں اٹھ پاتی تھی“۔ مسز مارشن مسکراتے ہوئے بولیں۔

”مجھے انجینی جگہ میں ٹھیک سے نیند نہیں آتی“۔ تاجیہ کہنے لگی۔ اور پھر یہاں

طرح طرح کا شور“

اور بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی۔

”Good morning every body.“۔ جان آ گیا تھا۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس کی متوحش سی آنکھوں میں جھانکا۔ غور سے۔
جیسے کہہ رہا ہو آج تو تمہیں آبی لیا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا“۔ مسٹر مارٹن بولیں۔ ”مسٹر عالم آج اتنی جلدی کیسے آگئے؟“

وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

”اور اصل پاس والے کیمین کا بندہ رات کو نہ خود سویا نہ مجھے سونے دیا“۔ وہ ایک نظر تاجیہ کی پریشان آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اور میں کروٹیں گنتا رہا۔ سو۔ اٹھ کر چلا آیا“۔

”اوہ“۔ مسٹر مارٹن کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیمین چونکہ پاس پاس ہیں۔ ہر نور ہر بات صاف سنائی دیتی ہے۔ اور پھر مجھے تو یہ شب جو صبح صبح سارٹ ہو جاتا ہے۔“ وہ مسکرائے۔ ”اس کے انجنوں کے شور نے مار دیا“۔

”This is what you have come to enjoy.“ جان

مسکراتے ہوئے بولا۔

”I Know, I Know.“ مسٹر مارٹن ہنس دیئے۔

وینریس جان کا ناشتہ لے کر آگئی تھی۔

وہ جوس پی رہا تھا۔

”اور اب مس“۔ وہ تاجیہ کی ہنسی جھکی نظروں کو اپنائیت سے دیکھتے ہوئے

بولا۔ ”تم کچھ نہیں بولوگی۔ آج ہی“۔

تاجیہ نے ہنسی نظریں اوپر اٹھائیں اور۔۔۔ بس۔

”اوہ۔۔ تو واقعی ارادہ نہیں ہے؟“

اس کے لب و لہجہ پر مدھری مسکراہٹ تاجیہ کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔“ جوس کا گلاس ہاتھ میں لئے وہ

بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

جان کی متلاطم آنکھیں بولتی نظریں جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ تاجیہ کی پلکیں

گرنے اٹھنے لگیں۔

”تم منہ سے نہ بولو تو کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے جوس کا گھونٹ بھرا۔

”تمہاری گرتی اٹتی پلکیں کل سے برابر مجھ سے باتیں کر رہی ہیں۔“

تاجیہ کا چہرہ متمنا تھا۔ ہاتھ میں پکڑا کاٹا کانپ کانپ گیا۔

”تمہارا سرخ چہرہ، لرزتے ہاتھ۔۔ سبھی تو بول رہے ہیں۔“

گھبرا کر تاجیہ نے مسٹر اور مسز مارٹن کی طرف دیکھا۔

”انہیں اردو نہیں آتی۔ تاہی یہ تمہاری پلکوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ تو۔۔

یہ تو۔۔“ وہ بہت آرام سے کانٹے سے نوالہ منہ میں ڈال رہا تھا۔ ”بہت مخصوص

زبان ہوتی ہے۔ اور۔۔ وہ بھی ایک مخصوص انسان کے لئے مخصوص ہوتی ہے

۔ ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ جاتی۔“

اوہ۔۔ وہ تھک سی گئی۔ چائے پئے بغیر ہی نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔

”اور اب۔۔ تم یہاں سے جاؤ گی نہیں۔“ اس کا ارادہ بھانپتے ہی وہ

بولا۔ ”جب تک میں بیٹھا ہوں تم بھی یہاں رہو گی۔“ اس وقت پھر اس کی

آنکھوں میں حاکیت تھی۔ آواز میں حکم تھا۔

اتنا۔۔ کہ وہ۔۔ واقعی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

پیالی میں چائے ڈالی اور آہستہ آہستہ پینے لگی۔

”Thats It.“ وہ بولا۔

اور پھر — مسٹر اور مسز مارٹن سے باتیں کرنے لگا۔
اپنی اپنی چائے ختم کر کے ان میاں بیوی نے معذرت کی اور اٹھ کر چل دیئے۔

ناجیہ نے بھی جلدی سے کپ میز پر رکھا اور اٹھنے لگی۔
اکیلے میں تو بہت مشکل تھا اس کیساتھ بیٹھنا۔ ابھی ان لوگوں کی موجودگی میں وہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔

”کہاں؟“ ہاتھ آگے بڑھا کر اس نے اس کے میز پر رکھے ہاتھ پر رکھ دیا۔
”میں نے کہا نا جب تک میں یہاں ہوں تم بھی یہیں رہو گی۔“
اور — دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکالتے ہوئے وہ پھر بیٹھ گئی۔

جان کوئی پینے لگا۔
”تو تم واقعی بات نہیں کرو گی“۔ قدرے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔
وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔
”خیر اب دیکھ تو لیتی ہو۔ کل تو یہ بھی نہیں تھا۔“
اور — تیوراً کرناجیہ کی پلکیں مگر گئیں۔
”چلو جھٹی ہو گئی“۔ جان نے گہری سانس لی۔
معا پر ویز لاؤنج میں داخل ہوا۔ جان کو دیکھ کر ادھر ہی آ گیا۔
”ہیلو“۔ دونوں کو گریٹ کرتے ہوئے وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
”شکر ہے تم آ گئے ہو۔ اس نے تو قسم اٹھائی ہے بات نہیں کرے گی۔“
جان بولا۔

”تم نے یقیناً کچھ کہہ دیا ہو گا۔“ پرویز کے لہجے میں شرارت تھی۔
”بائے گوڈ کچھ نہیں کہا“۔ جان کچھ نہ سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ اس کا خیال تھا پرویز اس کے ناجیہ سے پچھلے تلخ رویے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

”کچھ تو کہا ہوگا۔ تمہارا پچھلا رویہ بھی کچھ ٹوبل نہیں تھا۔ اور تمہارا اب کا رویہ بھی۔“ وہ جان کو معنی خیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔
 ”کوئی خاص شریفانہ نہیں ہے۔“

اور بات کی تہہ تک پہنچ کر۔ جان نے خفیف سا مسکراتے ہوئے کوئی کا کپ منہ سے لگالیا۔
 تبھی لاؤڈ سپیکر پر اناؤنس ہونے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہمارا شپ Mainz میں لگنے والا ہے۔ میز ایک وائن ٹاؤن ہے، دو ہزار سال پرانا۔ اس کا کتھیڈرل جو دیکھنے کے قابل ہے، ایک ہزار سال قبل کا ہے۔ میز کتابوں کی چھپائی کی جائے پیدائش بھی ہے۔ یہاں متحرک دھات کے طریقے پر چھپائی گئی سب سے پہلی کتاب منظر عام پر آئی۔ جو ہنزگٹن برگ پرٹنگ کے اس نئے فن کا موجد تھا۔ Gutenberg میوزیم اسی کی یاد میں تعمیر کروائی گئی ہے۔

شب گھنٹہ بھر یہاں رکے گا۔ آپ لوگ جا کر ٹاؤن میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ جو لوگ ہائیڈل برگ ٹرپ پر جانا چاہتے ہیں وہ تیار رہیں۔ کوچ انہیں لے کر جائے گی۔“

”یہ کوریئر بھی بور ہو گئی ہوگی۔ روز، روز۔ وہی باتیں دہرانا کافی مبر آزا کام ہے۔“ پرویز بھی ناشتہ کرنے لگا تھا۔

”تم ہائیڈل برگ جا رہی ہو؟“ جان نے تاجیہ سے سوال کیا۔

میز میں بواپسی شپ نے رات بھر رکنا تھا۔ یہاں وہ بعد میں بھی گھوم پھر سکتی تھی۔ اس وقت ہائیڈل برگ جانا ہی چاہئے تھا۔
 تاجیہ نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔
 ”وہ۔ تمہاری آنٹی کے ساتھ۔“

تاجیہ نے ایک بار پھر سر ”ہاں“ میں ہلا دیا۔

اور۔۔۔ جان نے جھنجھلا کر۔۔۔ میز پر کھ مارا۔

”کیا بات ہے؟“ پرویز نے پوچھا۔

”بات نہیں کر رہی۔“

اور۔۔۔ پرویز کا جاندار تھک گونجا۔

تاجیہ آہستہ سے اٹھ آئی۔ اب شاید جان کچھ نہ کہتا۔

اور واقعی وہ کچھ نہیں بولا۔ پرویز تھا شاید ساتھ دینے کو۔

”تم جارہے ہو ہائیڈل برگ؟“۔۔۔ جان نے پرویز سے پوچھا۔

”ہاں کیوں؟ تم نہیں جارہے؟“

”نہیں۔۔۔ شب پر رہوں گا۔“

”تمہیں تو جانا چاہئے۔“ پرویز کا لہجہ معنی خیز تھا۔

جان سمجھ گیا۔ مسکرایا۔

”نہیں۔۔۔ اول تو سوؤں گا‘ رات ٹھیک سے سویا نہیں۔ پھر آفس میں کچھ

کام بھی چیک کرنا ہے۔“

”میں بھی نہیں جاتا۔“

”کیوں؟ ہو آؤ۔“

”نہیں۔ تمہارے بغیر کیا کروں گا۔“

”یہ تو ہے۔“

”ویسے تمہیں جانا چاہئے تھا۔ تاجیہ اکیلا محسوس کرے گی۔“ اس کے لہجہ میں

شرارت تھی۔

”بات تو کرتی نہیں۔ اور پھر۔۔۔ اس کی آنٹی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی

بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔“

”تمہیں؟“

”ہم دونوں کو۔“

”دونوں کون؟“

”مجھے اور — اور —“ اس کا رنگ تاریک سا ہو گیا۔ آنکھوں میں سائے سے چھا گئے۔ یہ — Damn it — میں نام نہیں لوں گا۔“

پرویز اس اچانک وحشت کی وجہ سمجھ گیا۔ اسے نام ’ناجیہ‘ سے اس شدت سے نفرت تھی کہ وہ یہ نام زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔

اسے دکھ سا ہوا۔

”اچھا — تمہیں اور مس احمد کو“۔ پرویز نے اسے سنبھالا دیا۔

”ہاں“

”تو تم — میرا مطلب ہے۔ اس کی آنٹی سے صاف کہہ دو کہ تم مس احمد کو پسند کرتے ہو۔ پیار کرتے ہو“۔

”پیار؟“۔ جان جیسے چونکا۔

پرویز اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”اوہ“۔

پرویز نے کچھ ایسا اسے باتوں میں الجھایا — کہ وہ کہتا ہی چلا گیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا“۔

”ہاں پرویز — میں نے بہت کوشش کی، بہت چاہا کہ اس سے دور

رہوں، قریب نہ آؤں۔ اسی کوشش میں، میں نے بار بار اس کی انسلٹ کی۔ وہ

جب بھی سامنے آئی برا بھلا کہا۔ مگر — غور کیا — تو وہ انسلٹ وہ برا بھلا، اس

لئے نہیں تھا کہ وہ واقعی اس لائق تھی بلکہ یہ سب میں اس سے خوفزدہ ہو کر کرتا تھا۔

ہاں — میں خوفزدہ تھا اس سے۔ پہلے ہی دن میں نے محسوس کیا میں اس کی طرف

کھینچتا جا رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سے مات کھا جاؤں۔ مگر

پھر غیر ارادی طور پر نادانستگی میں — میں اپنے آپ کو اس کے آس پاس پاتا۔

تمام پیچرز کو چھوڑ کر اسی کی قربت تلاش کرتا۔ بے تکلف ہو کر بات کرتا اور پھر

جوں ہی خیال آتا وہ کون تھی؟ کہاں کی رہنے والی تھی؟ بغیر کسی وجہ کے اس کی انسلٹ کر آتا۔

پھر ایک دن — اپنی رو میں اپنے کیبن کی بجائے وہ میرے کیبن کا دروازہ کھول بیٹھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اتنا بڑا جرم نہیں تھا۔ میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور یقین مانو اس کی بے عزتی کرتے وقت بھی مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ مگر — میں نے بتایا نا مجھے اس سے ڈر لگتا تھا۔ اس کی بے پناہ معصومیت دیکھتے ہی میرے ارادے ڈانواں ڈول ہونے لگتے تھے۔

مجھے لگتا میں نے اب ہتھیار ڈالے کہ اب ڈالے۔ وہ بہت مضبوط کریکٹر کی لڑکی ہے اس کے باوجود میں نے اس وقت اس کے کریکٹر پر ہی چوٹ کیا۔

وہ چلی گئی۔ مگر اس کے چہرے کا کرب مجھے اور بھی بے کل کر گیا۔

اس شام وہ پہلی بار ڈنر پر نہیں آئی۔ میں بے چین ہوا تھا۔

کچھ ضمیر کی خلش — کچھ اپنی بے چینی کی خاطر۔

میں نے اسے ادھر ادھر ڈھونڈا۔ وہ ڈیک پر تھی۔ رو رہی تھی۔

اس واقعہ کے بعد سے میں نے اپنے رویے کی سختی کم کر دی۔ گو وقت بے

وقت مجھے دورہ ضرور پڑتا۔ شاید اس لئے کہ مجھے لگ رہا تھا۔ میں ہتھیار ڈال

دینے والا تھا۔

خود ہی اس کے پاس جاتا تھا — خود ہی اسے برا بھلا کہہ آتا تھا۔

پھر تم آئے۔ ڈانس والی شام سب تمہارے سامنے ہوا تھا۔ اس رات کے بعد

سے وہ میرے سامنے آنے سے کترانے لگی۔ مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔

کھانے میں میز پر ایسے اوقات میں آئی کہ میرا سامنا کرنا نہ پڑے۔ میں بے کل سا

ہو گیا۔ میز کے علاوہ ادھر ادھر اس کے پاس جاتا۔ وہ وہاں سے بھی نکل جاتی۔

اور پھر مجھے ایک عجیب سی بے چینی بے قرار رکھنے لگی۔

اس کے بعد۔ کل ہی چیئر لفٹس پر ہماری بات ہوئی۔ بات کیا۔ میں ہی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے تو ایک بھی بات نہیں کی۔

آج میں سویرے ہی میز پر آ گیا۔ میرا اندازہ تھا وہ یہیں ٹیبل پر ہوگی۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔ ”مگر۔ اس وقت بھی بات نہیں کی۔ کل تو سہمی ہوئی سی تھی۔ مگر آج۔ اس وقت مجھے لگا مجھے تنگ کرنے کو میری بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔“

”باپ رہے۔ یہ تو پیا نہیں ہے۔“ پرویز بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”پھر کیا ہے؟“

”عشق ہے عشق۔“

”بد معاش۔“

”اچھا سنو۔“

”ہوں۔“

”سیریس تو ہوتا؟“

”ہوں تو۔“

”پھر ماموں جان سے بات ہو جائے؟“

”آں۔ یہ میں ابھی نہیں کہہ سکتا۔“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں کیا ہے؟ میں اب بھی خوفزدہ ہوں اس سے۔“

”ہوں۔ کیا ناجیہ کو معلوم ہے کہ تم اسے پسند کرتے ہو؟“

”اس میں عقل خاصی کم لگتی ہے باقاعدہ بتانا پڑے گا۔“

”اور۔ وہ۔ میرا مطلب ہے ناجیہ بھی ایسا چاہے گی؟“

”ایسا چاہے گی یا نہیں مجھے ضرور چاہتی ہے۔“

”اوہ۔ تمہیں کیسے معلوم؟“

”اس کی گرتی اٹھتی پلکیں کہتی ہیں۔“

اور— پرویز انے شرارت سے سٹی بجائی۔

”اور ہاں— یہ تم اسے جا بجا اچکنا بھی اب چھوڑ دو۔“

”یہ تو میں تم سے یہ سب اگلو انے کو کر رہا تھا۔ نہ میں اسے اچکنا نہ تمہاری بے تابی بڑھتی۔ میں تو شروع دن سے سمجھ رہا تھا تم اس میں دلچسپی لیتے ہو۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”ویسے ماموں جان کہاں ہوں گے اس وقت؟“

”فرانس۔“

بس انہیں ہائیڈل برگ لے کر گئی۔ ہائیڈل برگ، قدیم یونیورسٹی ٹاؤن۔

وہ لوگ دیہاتوں میں سے گزرے، چھوٹے قصبوں میں سے۔ یہاں گھر سفید پیٹ کئے ہوئے تھے۔ کھڑکیوں پر کے سائبان رنگین دھاری دار تھے۔ ہر قصبے کا اپنا گرجہ تھا۔ اپنی دکانیں اور پرانے پتھروں کے مکان تھے۔

بس ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے یونیورسٹی سکور میں رک گئی۔ کوریئر نے انہیں بتایا۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی تیرہویں صدی عیسوی میں بنی تھی اور اس طرح سے مغربی یورپ کی سب سے پرانی یونیورسٹی تھی۔

گائیڈ انہیں طالب علموں کے قید خانے میں لے کر گئی۔ یہاں دیواروں پر طالب علموں کی نو سو سال پرانی تحریریں آج بھی دیکھی جاسکتی تھیں۔

گائیڈ نے ہی انہیں بتایا یونیورسٹی کے ڈائننگ ہال قدیم شاہی اصطبلوں سے بنائے گئے تھے۔

وہ لوگ ہائیڈل برگ شلوس گئے یہ تقریباً نو سو سال پرانا قلعہ تھا جسے فرانسیسیوں نے کئی بار تباہ کیا تھا۔ ہائیڈل برگ والوں نے یادگار کے طور پر قلعہ کا کچھ حصہ مرمت کئے بغیر چھوڑ رکھا تھا۔

یہ لوگ ہر سال گرمیوں میں شلوس اور دریائے نیکر سے آتش بازی کر کے حملے کی یاد مناتے ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا شراب کا بیرل بمعہ اس بونے کے مجسمے کے جس نے اسے پیاتھاقلے کے تہہ خانے میں محفوظ تھے۔

اس بیرل میں قریب ایک لاکھ دس ہزار لیٹریا زیادہ شراب آتی تھی۔
دریائے نیکر پر واقع دوہل اور مینار ہائیڈل برگ کے شاندر ماضی کی یاد دلاتے تھے۔

گائیڈ انہیں Philosophen Weg پر بھی لے کر گئی۔ یہ سرسبز و شاداب پہاڑی پر ایک آڑھاتر چھاراستہ تھا۔ یہیں ایک خوبصورت کینے کی رتھیں دھاری دار چھتریوں تلے بیٹھ کر ان لوگوں نے کوئی پی۔

انہوں نے پرانی طرز کا شیم انجن بھی دیکھا۔ جسے سیاحوں کے لئے دریائے نیکر کے ساتھ ساتھ آج بھی چلایا جاتا تھا۔

پھر شلوس ہوٹیل دیکھا۔ قدیم ہوٹیل۔ جہاں یورپ کے بادشاہ اور ان کی ملکہیں آکر قیام کیا کرتی تھیں۔

کوریر نے انہیں بتایا۔ ہائیڈل برگ ان چند شہروں میں سے تھا۔ جسے اپنی بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے جنگ عظیم دوم میں دونوں جنگی اطراف سے بغیر چھوئے چھوڑ دیا گیا تھا۔

مین سٹریٹ پرانے اور نئے ریسٹورانوں سے اُٹی پڑی تھی۔ ان میں سے کچھ ریسٹورنٹ نو سو سال پرانے بھی تھے۔ انہوں نے تسم ذیلین میں کھانا کھایا جو تقریباً چھ سو سال پرانا ریسٹورنٹ تھا۔

درود یوار انوکھے تھے، فضا تک نہالی تھی۔ ہر چیز، ہر جگہ بہت نئی اور بہت دلچسپ تھی۔

نکر۔ وہ ہل ہل چوٹک جاتی۔ لمحہ لمحہ بھٹک جاتی۔

نظریں وہیں ہر یالیوں میں، گزر گاہوں میں۔

کچھ ڈھونڈنے لگتیں، کھوجنے لگتیں۔

آئی تھیں، بختی تھا۔ مگر۔۔ بار بار اسے لگتا۔

وہ اکیلی ہے، تنہا ہے۔

اس کی نظریں کس کو ڈھونڈ رہی تھیں؟ وہ تنہا کیوں محسوس کر رہی تھی؟

شام شپ پرواپس آ کر ڈنر کے لئے لاؤنج میں داخل ہوئی۔

دور کونے والی میز پر پرویز کے ساتھ جان کو بیٹھا دیکھا۔ تو دل یکبارگی

دھڑک اٹھا۔ اس کی نظریں اسی کو تو ڈھونڈ رہی تھیں۔ تنہائی کا احساس بھی تو جاتا

رہا تھا۔

اور پھر۔۔ اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا تھا؟

اس کے ایک ہی دن کی غیر موجودگی میں اگر اس کی نظریں اسے ادھر ادھر

تلاش کر رہی تھیں۔ ایک ہی دن وہ ساتھ نہیں تھا تو وہ تنہا محسوس کر رہی تھی۔

تو۔

تو۔ آگے کیا ہوگا؟ جب ان کا سفر ختم ہو جائے گا اور وہ دونوں اپنے اپنے

راستے پر چل دیں گے تو۔

اور پھر۔۔ انگلینڈ جا کر وہ تو پاکستان جائے گی۔ پاکستان؟

اور دوری کے احساس سے ہی وہ ہراساں سی ہوگئی۔

یہ کیا ہو گیا؟ پریشان کن سوچوں میں کھوئی وہ کھانا کھاتی رہی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ اوپنڈیک پر آگئی۔

مسز مارٹن بتا رہی تھیں آج کا آسمان بہت صاف اور سورج بہت گرم تھا۔

ڈیک تانبے کی طرح تپ رہا تھا۔ انہیں ساراوق نیچے لاؤنج یا پھر کیمین میں گزرتا

پڑا تھا۔

واقعی۔۔ اس وقت بھی ہوا میں وہ خنکی نہ تھی جو کل شام کو تھی۔ کئی پنجر زاب بھی ڈیک پر موجود تھے۔ وہی دیس دیس کی بولیاں، ہنسی کی ملی جلی آوازیں۔ اس نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ بارج، سینرز اس وقت بھی شپ کے پاس سے آ جا رہے تھے۔ کناروں پر کھڑے کچھ لوگ مسافروں کی طرف ہاتھ ہلا رہے تھے۔

وہ واپس نیچے آ گئی۔ امی کو خط لکھا تھا، ابھی پوسٹ نہیں کیا تھا۔ اٹھا کر اوپر ریسپشن کی طرف آ گئی۔ وہیں نزدیک لینز بکس تھا۔ خط ڈال دیا۔ آہستہ آہستہ چلتی نیچے کیمبن کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ ”ہیلو“۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ جان تھا، اوپر آ رہا تھا۔ اس کے لب داہوئے۔ ”ہیلو“ کہنے کو۔ مگر پھر۔۔ جیسے اسے یاد آیا۔

مسکرا دی صرف۔ دھیرے سے۔

”ہائیڈل برگ اچھا لگا؟“

اس نے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

خوبصورت ہونٹوں پر اب بھی دلکش مسکراہٹ تھی۔

شرقی آنکھیں خاموشی سے اس پر لگی تھیں۔

کتنی نرالی تھی یہ ادا!

وہ مسکرا دیا۔ ہولے سے۔

”کھانا کھا لیا؟“

اس نے دوبارہ سر آہستہ سے ہاں میں ہلا دیا۔

یا تو قی لب مسکرا رہے تھے۔ دلنشین آنکھیں مکمل ساتھ دے رہی تھیں۔

کتنا انوکھا تھا یہ انداز!

مسور سا ہوتے ہوئے جان نے گھنی پلکیں جھپک لیں۔

”ٹائم کیا ہوا ہے؟“ اس نے اچانک سوال کر دیا۔

اور — آہستہ سے ناجیہ نے گھڑی والا ہاتھ سامنے کر دیا۔

چپ چاپ۔

اس کی ادائیں نرالی تھیں، انداز انوکھے تھے۔

مگر — مبر آزما۔

جھنجھلاتے ہوئے اس نے اس کا وہی ہاتھ تھام لیا۔

گھڑی پر نظر ڈالی۔

ناجیہ نے دیکھا۔ اس کی اسی کلائی پر گھڑی بندھی تھی۔

ورعین وہی ٹائم بتا رہی تھی جو ناجیہ کی گھڑی میں تھا۔

تو — یہ صرف اس سے بات کروانے کو پوچھا تھا اس نے۔

اس نے آہستہ سے ہاتھ کھینچا۔

مگر — جان نے گرفت مضبوط کر لی۔

”بات کرو نا“۔ اپنائیت کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ بھی تھی۔

اس نے پھر ہاتھ کھینچا۔ بولی کچھ نہیں۔

”بولو ورنہ ہاتھ نہیں چھوڑ دوں گا“۔ وہیں سیڑھیوں میں کھڑا وہ تکرار کر رہا تھا۔

ناجیہ نے ایک بار پھر کوشش کی۔

وہ اب بھی سختی سے اس کا ہاتھ پکڑے جھنجھلایا جھنجھلایا کھڑا تھا۔

تبھی سیڑھیوں کے اوپر والے سرے پر قدموں کی آہٹ ہوئی۔

جان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ناجیہ مسکرا دی۔

اس کی آنکھوں میں فتح کی جھلک دکھ کر — جان کچھ تیز تیز سا۔ غصہ غصہ

سا۔ اوپر چڑھنے لگا۔

آج وہ بہتر سوئی تھی۔ آنکھ کھلی تو صبح کی چائے سرو ہو رہی تھی۔ برتنوں کی
 کھنک سے ہی شاید اس کی آنکھ کھلی تھی۔
 وہ اٹھ کر کھڑکی میں آنکھڑی ہوئی۔

یہ Mannheim تھا۔ شپ رائین اور دریائے نیکر کے سنگم پر لتکر انداز
 تھا۔ جٹکشن، جس کی وجہ سے مینیم کو یورپ کے دوسرے بڑے اندرونی بندرگاہ کی
 اہمیت حاصل تھی۔

بڑی بڑی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ سٹریٹ، بازار وغیرہ۔
 وہ پلٹی۔ ضروری چیزیں اٹھائیں اور نہانے چل دی۔
 بادامی رنگ کی شلوار قمیض اور دوپٹہ لے کر اس نے بھیجے بال سلجھائے — او

رکیمین لاک کر کے آنٹی کی طرف آ گئی۔

”بیٹا میں تو ناشتہ کر چکی۔ چار بجے کی جاگ رہی ہوں۔ سر بھاری ہو رہا تھا، اس لئے اکیلی ہی چلی گئی، اتنا سویرے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“ وہ واقعی ست لگ رہی تھیں۔

”کوئی بات نہیں آنٹی۔ میں بس جلدی سے ناشتہ کر کے آتی ہوں۔ آپ کے سر میں مالش کروں گی۔ اس کے بعد دھو لیجئے گا۔“

آنٹی شفقت سے مسکرا دیں

اور۔۔۔ وہ اوپر لاؤنج کی میز حیاں چڑھنے لگی۔

”اس طرف نہیں۔ وہاں۔“ لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے جان نے آیا۔

وہ سنجیدہ تھا۔ اس کی آواز میں تحکم تھا۔

وہ اسے ان کی مشترکہ میز کی طرف نہیں بلکہ دور بار کی طرف کونے والی خود جان کے لئے مخصوص میز کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

”آؤ۔“ وہ اس کے برابر آ گیا۔

اور۔۔۔ تاجیہ کے قدم اس کے ساتھ ساتھ اٹھنے لگے۔

”بیٹھو۔“

وہ بیٹھ گئی۔ چپ چاپ۔

ویٹر نے جلدی جلدی دونوں کے آگے ناشتہ لگا دیا۔

”کل Enjoy کیا؟“ جوس کے بڑے بڑے گھونٹ لیتے ہوئے وہ بولا۔

اس نے۔۔۔ حسب سابق اثبات میں سر ہلادیا

لب متبسم تھے۔ خوبصورت آنکھوں میں کئی جذبے گڈمڈ نظر آرہے تھے۔

کچھ شوخی سی تھی، کچھ اداسی سی تھی اور۔۔۔ اور۔۔۔ کچھ شاید۔

ٹھکے سے تھے۔

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے۔

”مجھے یاد کیا تھا؟“

اور۔۔۔ خوبصورت شربتی آنکھوں کی اداسی جیسے گہری ہو گئی۔ ٹھکے جیسے نمایاں ہو گئے۔

وہ اداس تھی۔ کہ یہ سب کیوں ہوا تھا؟ ایسی بات جس کی کوئی منزل ہی نہیں تھی۔

اور۔۔۔ وہ محظوظ ہوا۔ کہ وہ اداس رہی تھی۔ اس کے لئے۔ اس کی کہانی کو انجام نظر آ گیا تھا۔

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

وہ غیر یقینوں کا شکار تھی۔ اس لئے اداس تھی۔

اور۔۔۔ جان کو۔ یقین آ گیا تھا۔ اس لئے خوش تھا۔

پھر اچانک۔۔۔ جان کی آنکھوں میں شوخی اتر آئی۔ لب شرارت سے پھڑ پھڑا اٹھے۔

میں نے تمہیں بہت یاد کیا تھا۔ نہ جانتیں تو اچھا تھا۔

تھوڑا سا تو وقت رہ گیا ہے۔ پھر پتہ نہیں تم کہاں ہو گی اور میں کہاں۔۔۔ وہ

اس کی آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر کہتا گیا۔

شربتی جھیلوں میں ٹھکے ٹپ اٹھے۔ پلکوں کے سائبان لرزنے لگے۔

خاموشی لئے۔ چپ چاپ۔

”کل شام ہونے سے پہلے پہلے ہم سڑ اس برگ‘ فرانس‘ پہنچ جائیں گے۔

بابا جان وہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں وہیں اتر جاؤں۔۔۔“

سائبان بے اختیار اوپر اٹھ گئے۔

شربتی جھیلوں میں رنگوں کا بھونچال آ گیا۔

گلابی، سرخ، سنہری بدلیاں منڈلا نے لگیں۔

وہ۔ ایک ننگ دیکھے گیا۔

”پھر ہم۔ شاید۔ ایک دوسرے کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکیں۔“

ارغوانی رنگوں میں طغیانی آگئی۔ موجیں بند سے سر ٹکرانے لگیں۔

”پلیز نہیں۔“ جان گھبرا کر بول اٹھا۔ ”میں کل فرانس میں نہیں اتروں

گا۔ پلیز۔“

اس کے بھیگ ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ زنجی سی گھاسیل سی۔

کل نہیں تو۔ چند روز بعد۔ ہونا تو یہی تھا۔

اور پھر۔ وہ وہاں مزید نہ رک سکی۔ ناشتہ کئے بغیر ہی میز سے اٹھ آئی۔

سیڑھیوں میں آ کر آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ آنٹی کے کیبن میں گئی۔ ان کے سر

میں مالش کیا۔

اور پھر اپنے کیبن میں آ کر بستر پر اوندھی پڑ رہی۔

ایسا کیوں ہوا تھا؟ اتنی اداسیاں اور اتنی تنہائیاں تو اسے ڈس ڈس لیں گی۔

کیا وہ چھٹیاں گزارنے، تفریح کرنے شب پر اسی لئے آئی تھی۔ مستقل

اداسیاں اور لاتنا ہی تنہائیاں سمیٹنے؟

بے بس ہو کر وہ رو دی۔

اور پھر۔ تھک ہار کر شاید اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

دروازے پر دستک سے وہ چونک اٹھی۔

گھڑی دیکھی تین بج چکے تھے۔ اسے حیرت ہوئی اتنی دیر تک وہ کیسے سوتی

رہی تھی۔ اُہ کھولا۔

سیور ڈیس بھی۔ کھانے کی ٹرے لئے گھڑی تھی۔

”آپ کا لنچ میڈم۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”مسٹر عالم نے کہا تھا آپ

کے کیبن میں پہنچایا جائے۔“

اس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر اس نے میز پر رکھ دی۔
 ”کیا چاہتے ہو جان تم؟“ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے ایک گہری
 اداس سانس لی۔
 کھڑے کھڑے ہی دو تین نوالے لئے۔ اور پھر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے
 لگی۔

موسم آج بھی گرم تھا۔ دھوپ آج بھی تیز تھی، کل سے کچھ زیادہ ہی۔
 وہ تیار ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں بس انہیں Baden Baden
 لے جانے آرہی تھی۔

بس انہیں لئے بلیک فارسٹ کے درختوں سے ڈھکے پہاڑوں میں سے گزر
 ہی تھی۔ جگہ جگہ چشمے اور آبشار تھے۔

بیدن بیدن پہنچ کر کوچ رک گئی۔ آئی اور مجتبیٰ کے ساتھ وہ بھی اتر آئی۔
 دھوپ اب بھی خاصی اوپر تھی۔ تاحد نظر پھول ہی پھول کھلے نظر آ رہے تھے۔
 نوخیز اور شوخ رنگوں کے پھولوں کی مہک ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔
 تمام ٹاؤن کے گرد بلیک فارسٹ کے ڈھلان تھے۔ انگوروں کے باغات
 تھے، کھنے جنگلات تھے۔

یہاں شاندار عمارتیں تھیں۔ بلند و بالا ہوٹل تھے۔
 باقی مسافروں کے ساتھ وہ لوگ بھی کھوم پھر رہے تھے۔
 انہوں نے دیکھا۔ قدیم سرخ، چھتوں اور شاہانہ ستونوں والے مکانات کے
 بچپوں آج کا موڈ رن کونفرنس ہال ایسا وہ تھا۔

کوریر نے بتایا۔ کہ اس شہر میں تاب کار نمکین پانی کے چشمے تھے۔ دو ہزار
 سال سے یہ گرم چشمے طبی مقاصد کے لئے استعمال ہوتے آ رہے تھے۔
 دم لینے کو آئی چند ہل کے لئے رک گئیں۔ تاجیہ بھی ان کے ساتھ رک گئی۔
 ارد گرد سرسری نظریں دوڑائیں۔ سامنے دیکھا۔

جان تھا، پرویز کے ساتھ مسافروں کے ہجوم میں۔ مگر نظریں اسی پر لگی تھیں۔
اس کی دلنشین آنکھوں میں یگانگت تھی، اپنائیت تھی۔
اس نے رخ پھیر لیا۔ وہ پھر سے اداس ہو گئی۔

یہ چند روز کی یگانگت، گنے چنے دنوں کی اپنائیت اسے مار دے گی۔ وہ
جانتی تھی۔

وہ دونوں آگے بڑھ آئیں۔

دو سو سال پرانے Kurhaus کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔
بڑے بڑے مضبوط ستون تھے۔ پتھر کی سیڑھیاں تھیں اور قدیم فانوس تھے۔
مجتبیٰ بھی آپہنچا۔ کئی تصویریں لیں۔

پھر وہ شوپنگ سنٹرز میں گھومے، چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔
پھر مجتبیٰ ان دونوں کو ایک پارک میں لے آیا۔

بہت خوبصورت پارک تھا، بہت ہی سرسبز۔ نرم مٹیلیں گھاس ٹھنڈی اور سرسبز
بخش تھی کھنے درخت جگہ جگہ سایہ کئے تھے۔

آنٹی ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ مجتبیٰ وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔
تاجیہ نے سینڈل اتاری اور آنٹی کے پاس بیٹھ کر۔ نرم نرم گھاس کو اپنے پاؤں
سے محسوس کرنے لگی۔

اس نے دیکھا مقامی لوگوں کے علاوہ شب کے اور بھی کئی پنجرے تھے۔ وہ تو
انہیں یوں جاننے لگی تھی جیسے ہفتے بھر سے نہیں ہمیشہ سے ساتھ ساتھ ہوں۔
انہی میں جان بھی تھا۔ کچھ فاصلے پر سر بازوؤں کے حلقے میں لئے گھاس پر
اوندھا لیٹا تھا۔

اس نے عام جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ چہرہ بازوؤں میں ڈھکا تھا۔
مگر۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ جیسے اس کی آس پاس کی فضا تک میں اس کی شخصیت کی آن
بان تھی، تنکم بول رہا تھا۔

تبھی۔ فریج لڑکی کیتھرین اس کے قریب آئی۔

اس سے لگ کر بیٹھتے ہوئے۔ اس کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

جان نے سر اٹھانا چاہا، تو جھک کر کیتھرین نے کئی پار کر ڈالے۔

جان سیدھا لیٹا۔ تو سر اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کیتھرین وہیں لیٹ رہی۔

یہ یورپ تھا۔ مہینہ بھر میں تاجیہ نے ایسے ان گنت سین دیکھے تھے۔ اب تو اسے بھی یہ سب نیا نہیں لگتا تھا۔ مگر۔۔۔ پھر۔۔۔

یہ جہن کیسی؟ یہ بے کلی کیسی؟

جان اٹھ کر سیدھا بیٹھ گیا۔ کیتھرین اس کے زانو پر سر رکھے پڑی رہی۔

جان نے۔ اس کا سر اٹھاتے ہوئے اسے بٹھایا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر۔ اس کی نظریں تاجیہ کی نظروں سے ملیں۔

وہ مسکرایا۔ اپنائیت سے۔ مگر۔ پھر۔ چونکا۔

تاجیہ کی نظریں بے چین تھیں۔ اور۔ اور۔ جیسے شکایتیں لئے تھیں۔

تو۔ وہ یہ سب دیکھ رہی تھی۔

مگر۔ اس میں۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا نا۔

اور پھر۔ وہ ہنس دیا۔ دھیرے سے۔

خود بھی دور دور رہتی تھی۔ کسی اور کے بھی پاس آنے کو برداشت نہیں کرتی تھی۔

بچے تلے، مستحکم قدم اٹھاتا۔ وہ مسافروں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔

تاجیہ نے ایک گہری سانس لی۔

معلوم تھا کہ چند روز کا ساتھ ہے۔ پھر۔ کسی کو اپنا سمجھنے سے مطلب؟

مگر۔ یہ تو۔ شاید اپنے بس کی بات نہ تھی۔

آئی کچھ دیر پہلے منرل دائر کی خریدی ہوئی بوتل منہ سے لگائے تھیں۔

”کیا پتہ ٹانگ کا درد ٹھیک ہو جائے؟“ گھونٹ لیتے ہوئے وہ ہنس رہی تھیں۔

ناجیہ بھی مسکرا دی۔ وہی اداس زخمی سی مسکراہٹ!
 ”آئیں۔ اس کینے میں چل کر کچھ کھاتے پیتے ہیں۔“ مجتبیٰ نے سڑک کے
 اس پار ایک Pavement Cafe کی طرف اشارہ کیا۔
 وہ تینوں اس طرف چل پڑے۔

بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی گول میزیں لگی تھیں۔ ہر میز کے
 ساتھ دو۔ دو کرسیاں تھیں۔ قریب ہی نیچی سی باڑ کینے کو عام گزرگاہ سے علیحدہ کر
 رہی تھی۔

مجتبیٰ قریبی میز پر اور ناجیہ اور آنٹی اکٹھی بیٹھ گئیں۔
 مجتبیٰ نے اپنے اور آنٹی کے لئے کوئی اور ناجیہ کے لئے آئس کریم منگوائی۔
 ساتھ ہی بسکٹ اور سینڈوچز۔

ناجیہ نے اطراف پر نظریں دوڑائیں۔
 ہر جگہ پھول ہی پھول نظر آ رہے تھے۔ رنگ برنگے ہزاروں کی تعداد میں۔
 گرتے پانیوں کا شور تھا۔ موسیقی لئے مدھر روح پرور۔
 اطراف پر کے پھولوں۔ سبزے اور گرتے پانیوں کے باوجود۔ دھوپ کی
 تیزی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چھتری کے اور بھی اندر ہو گئی۔
 قریب سے ہی ایک جاندار قہقہہ ابھرا۔ ناجیہ نے دیکھا۔
 دائیں طرف دو میزیں چھوڑ کر پرویز اور جان بیٹھے تھے۔
 دونوں اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور دونوں اب بھی ہنس رہے تھے۔
 رخ واپس پھیر کر اس نے نظریں سامنے کے درختوں سے گھرے چشمے پر جما
 دیں۔

مجتبیٰ کی میز کی خالی والی کرسی پر مسز براؤن آ کر بیٹھ گئیں۔ آنٹی ان سے
 باتوں میں لگ گئیں۔
 ”تم نے کبھی کسی کو دیکھا ہے۔“ مجتبیٰ ماں کو معروف پا کر ناجیہ سے مخاطب

ہوا۔

”صرف نام سنا ہے۔“

یہاں کا کسیو جرنی کا قدیم ترین اور اعلیٰ ترین کسیو ہے۔“

”آپ آئے ہیں پہلے یہاں؟“

”نہیں۔ مگر جرنی تو کئی بار آیا ہوں۔ پتہ تو ہے کہ بیدن بیدن کا کسیو بہت

خاص کسیو ہے۔ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔“

”پھر؟“ وہ مسکرائی۔

”پھر کیا۔ ماما کے ہوتے ہوئے جا سکتا ہوں۔“ وہ مایوس سا مسکرایا۔ ”بس

دور سے ہی دیکھ سکتا ہوں۔“ اس نے کچھ فاصلے پر بازار کی رونقوں کی طرف

دیکھا۔

اسے ڈرگس، کسیو ز سے خاص رغبت تھی۔

”مجتبیٰ بھائی یہ سب اچھا نہیں ہے۔“ مجتبیٰ کی آنکھوں میں کسیو کے لئے اتنی

خواہش دیکھ کر وہ بولے بنانا رہ سکی۔

”ہاں۔“ وہ کچھ کھویا کھویا سا اسے دیکھنے لگا۔ ”کوئی اچھا سا تھی مل جائے

گا۔ تو چھوڑ دوں گا سب۔“

ناجیہ کی ہلکیں جھپکنے لگیں۔

”وہ... وہ مہ پارہ کیسی لڑکی ہے؟“

”اوہ۔ اچھی ہے۔ مگر۔ مجھے وہ لڑکیاں نہیں پسند۔ جو۔ ایک ہی

اشارے پر چلی آئیں۔“

”آپ کا مطلب ہے دوسرے اشارے پر آنا چاہئے تھا اس کو آپ کے

پاس۔“ مسکراتے ہوئے وہ ماحول کا جو جمل پن دور کرنے کی خاطر بولی۔

”You naughty girl.“ جلدی آنکس کریم ختم کرو۔ واپس بھی جانا

ہے۔ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

شام ہونے سے پہلے پہلے وہ لوگ دوبارہ کوچ میں بیٹھ گئے۔

وہ آنٹی کے ساتھ تھی، مجتبیٰ مہ پارہ کے ساتھ۔

حسب معمول کوریئر نے کنتی کی۔

ایک سواری کم تھی — کون؟

”کیترین“ — پیچھے سے ایک لڑکی بولی۔ کیترین کی ساتھی تھی شاید۔

ناجیہ نے دیکھا۔ اس کی اگلی سیٹ پر بیٹھا جان اٹھا — اور کوچ سے نیچے اتر

گیا۔

پھر — دومنٹ بھی نہ گزرے تھے — کہ وہ کیترین کو لئے چلا آ رہا تھا۔

کوچ کے پاس پہنچ کر اس نے اسے اندر چڑھنے کا اشارہ کیا اور اس طرح

کیترین آگے اور وہ پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئے۔

”یہاں“ — کیترین کی ساتھی نے اپنی برابر والی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

کیترین اس طرف بڑھی۔ اور جان — اپنی سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے — پچھلی

سیٹ پر بیٹھی ناجیہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

جہاں ناجیہ کی آنکھوں میں حسد جھلک رہا تھا۔

وہاں — جان کی نظروں میں شرارت تھی، چھپڑ تھی۔

وہ کوریئر سے کچھ ڈچ زبان میں بولا۔ آگے بڑھ کر کوریئر نے اس کا پیغام

ڈرائیور کو دیا۔

اور — کوچ چل پڑی۔

ڈنر کے بعد وہ آنٹی کے ساتھ اوپڑیک پر آگئی۔

ہر سواچانک سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ شام کے اندھیرے وقت سے پہلے گھر

آئے تھے۔

مینٹسم ناؤن کے اونچے بلڈنگ روشن ہو گئے تھے۔ اور — بندرگاہ اور شپ

کی بیرونی بتیاں بھی قبل از وقت جل اٹھیں تھیں۔

مگر۔ تمام آکاش پر بادلوں کا راج ہوتے ہوئے بھی ہوا کا نام و نشان نہیں تھا۔ سخت جس اور گرمی ہو رہی تھی۔ دن بھر کی تیز دھوپ کی وجہ سے ڈیک کا دھات کا فرش اب بھی گرم لگ رہا تھا۔

آئی ایک معمر جرمین آئی سے تنہیم کے متعلق معلومات حاصل کر رہی تھیں۔
ناجیہ ان سے اجازت لے کر نیچے آ گئی۔ اپنے ایئر کنڈیشننگ میں آ کر اس کی جان میں جان آئی۔

کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی وہ بستر پر پڑ رہی۔ مختلف سوچوں میں کھوئی۔ جانے کس وقت نیند نے آ لیا۔

دھڑام سے کھڑکی کھلی۔

میز پر سے کاغذ اڑ کر اس کے بستر پر آ رہے۔

بڑبڑا کر وہ جاگ اٹھی۔

چند لمبے تو وہ سمجھ ہی نہ سکی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھلی کھڑکی کو دیکھتی رہی۔

باہر آسمان میں آتش بازیوں ہو رہی تھیں، پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہوا کے تیز جھکنے چل رہے تھے۔ بارش کا پانی ہوا کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ پانی کی جیسے چادر تن گئی تھی جو آسمان سے شب اور شب سے لینڈنگ سٹیج پر ایک دھماکہ خیز آبشار کی مانند گر رہی تھی۔

باوجود منبھوٹی سے بندھے ہونے کے دیو قامت شب کاغذ کی ناؤ کی طرح ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔

وہ بستر میں سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ ایسی بارش ایسا طوفان اس سے قبل اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنی ہمت نہیں تھی۔ کہ اٹھ کر کھڑکی ہی بند کر لیتی۔

محاذ و رک کی گرج ہوئی۔ کئی بجلیاں ایک ساتھ تڑپیں۔ جیسے شعلے سے لپکے۔ اس کا تمام کمر روشن ہو گیا۔

مارے خوف کے وہ انھی۔ اور بھاگی آنٹی کی طرف۔
 ”خیریت؟“ وہ کوریڈور کے مخالف سمت سے آتے جان کے بازوؤں میں
 تھی۔

”وہ۔ وہ۔ طوفان۔“ جلدی میں پہننے اس کے ہاف لینتھ گاؤن میں
 سے جھانکتے سینے میں چہرہ چھپائے ہاتھ سے اپنے کین کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے وہ سبھی سبھی سی بولی۔
 اسے ہنسی آگئی۔

”تمہارے کین میں؟“
 ”ہاں۔“

وہ مزید ہنس دیا۔ مارے گھبراہٹ کے۔ طوفان اسے صرف اچھپے کین
 میں ہی نظر آ رہا تھا۔

”کین کا طوفان تمہیں نظر آ گیا۔“ اسے بازوؤں میں لئے سینے سے
 جکڑے وہ دھیرے سے بولا۔ ”اور۔“ یہاں جو طوفان مچل رہے ہیں۔ کتنے
 دنوں سے۔ وہ تمہیں نظر نہیں آتے۔“

تاجیہ کو تو بس ایک ہی بات کی خبر تھی۔ کہ آندھی اور بارش کے جس طوفان
 سے وہ خوفزدہ ہو کر بھاگی تھی۔ جان کے بازوؤں میں آکر، اس کے سینے سے
 لگ کر وہ خوف جاتا رہا تھا۔ اور بس۔

”ہوں۔ بولوتا۔“

اس کی آواز میں جذبات کے ٹھاٹھیں مارتے سینکڑوں سیلاب تھے۔

سینے کے زیر و بم میں پھرے ہزاروں طوفان تھے۔

سیلاب۔ جو باہر کے سیلاب سے کہیں زور آور تھے۔

طوفان۔ جو باہر کے طوفان سے کہیں منہ زور تھے۔

تاجیہ نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

جان نے ایک نظر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
ہولے سے مسکرایا۔

اور — دھیرے سے اپنے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔
ایک پل کو ناجیہ جیسے سکتے میں آ گئی۔ اور پھر — اس کی نظروں کی تاب نہ
سکی۔ غیر ارادی طور پر سر دوبارہ اس کے سینے سے جاٹکا۔
جان کی آنکھوں میں شوخی اتر آئی۔ مسکراہٹ میں شرارت رچ بس گئی۔
”جو طوفان تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اس سے تو تمہیں ڈر لگتا ہے۔“ اس کے
بازو اب بھی اسے گھیرے میں لئے تھے۔ ”اور — جو طوفان تمہیں لے ڈوبے گا۔
اس کے بار بار پاس جاتی ہو۔۔۔۔“

اب وہ اس کی باتیں سمجھنے لگی تھی۔ تجلی سی ہو کر سراو پراٹھایا۔
پھر — اپنے گرد لپٹنے اس کے بازو دہانے لگی۔
”اوں — ہوں —“

وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
”پہلے وعدہ کرو باتیں کرو گی مجھ سے۔“
”کروں گی۔“ اس نے جان کے بازو کھول دیئے۔

”چلو میں تمہیں تمہارے کیمبن میں چھوڑ آؤں۔“ وہ اسے کندھے سے تھام
کر ساتھ چل پڑا۔ ”دیکھیں تمہارے کیمبن میں کیسا طوفان آرہا ہے۔
وہ آہستہ سے ہنس دی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اس نے گھبراہٹ میں ایسا ہی تو
کہا تھا۔

”آؤ۔“ ناجیہ سے پہلے اس نے اس کے کیمبن میں جا کر لاسٹ آن کیا۔
”باپ رے — یہاں تو بچ بچ طوفان آیا ہوا ہے۔“ آگے بڑھ کر اس نے کھڑکی
بند کر کے چٹنی لگا دی۔

دونوں ہاتھ پہلوؤں پر دھرے وہ کمرے کے وسط میں کھڑا اس اس نظر

دوڑا رہا تھا۔

تمام میزگیلی بھی، میز پر رکھی چیزیں اس کے بستر تک اڑ کر بکھری پڑی تھیں۔ پانی کا ریلہ اس کے بستر کو بھگو گیا تھا۔ وارڈ روب کا دروازہ چوٹ کھٹا تھا۔ واش بین پر کا پردہ ایک طرف اٹکا تھا۔ ٹیلکم پاؤڈر، پرفیوم، کئی چیزیں نیچے گری پڑی تھیں۔ بالکل جیسے ابھی ابھی کشتی لڑنے والوں کا گزر ہوا ہو۔

باہر — بارش اور آندھی کا طوفان اب بھی زوروں پر تھا۔

وہ دروازے میں نادام سی کھڑی تھی۔ رات سوتے وقت اپنی لا پرواہی سے کھڑکی کی چٹائی نہ اگا کر کیمین کا حلیہ بگاڑنے میں غلطی اسی کی تو تھی۔ وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

”میں جا کر کسی کو بھیجتا ہوں۔ تمہارا بستر بدل دیں، کمرہ ٹھیک کر دیں گے۔ تب تک تم میرے کیمین میں آ جاؤ۔“

”میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ جبکی جبکی نظریں لئے وہ کیمین کے اندر آ گئی۔
 ”آؤ نا۔“ اس کے قریب آتے ہوئے وہ اس کے ماتھے پر گھر آئے بال ہٹاتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”ڈر لگتا ہے۔“

”اب بھی؟“ اس نے اپنائیت سے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔

”اس نے جھکا سر اثبات میں ہلا دیا۔“

”کس چیز سے؟“

وہ اس کے بالکل پاس کھڑا تھا۔ چہرہ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں اسکی بند بند آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ اور — مہکی مہکی، گرم گرم سانسیں تاجیہ کی بے ترتیب سانسوں میں گھل رہی تھیں۔

”بتاؤ تا—ہاں—“ انگلی سے اس کے چہرے پر لکیر بتاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی آواز جذبات سے بھاری ہو رہی تھی۔
 ”آ... پ سے“۔ اس نے بمشکل کہا۔
 ”اوہ“۔

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ مدھر دلنشیں نہی۔

”So now you know what a storm is۔“ ہاں۔
 وہ آہستہ سے پیچھے ہٹ گئی۔ جھکی نظریں لئے مسہری کی پشت تھام کر کھڑی ہو گئی۔

”او کے میم... میں بھیجتا ہوں کسی کو“۔ وہ چلا گیا۔
 اور— ماؤف ذہن لئے— وہ میز کے پاس کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔





صبح اس کی آنکھ قدرے دیر سے کھلی۔

کھڑکی کھول کر اس نے دیکھا۔ رات کے قیامت خیز طوفان کے بعد اس وقت مطلع صاف تھا۔

سنہری دھوپ نکل آئی تھی۔ نیلگوں آسمان پر اکادکا سفید بادلوں کے ٹکڑے نرم خرامی سے آ جا رہے تھے۔ ہوا ٹھنڈی اور — موسم بے حد سہانا ہو رہا تھا۔

نہا دھو کر اس نے ہلکے اور تیز براؤن پھولوں والی کاشن کی شلوار قمیض پہنی۔ ڈارک براؤن شفون کا دوپٹہ لیا۔ براؤن ہی جوتی پہنی۔ کیلے بال سلجھائے — اور — اوپر لاؤنج کی طرف ناشتہ کرنے چل دی۔

”آج سہ پہر تک ہم لوگ سزا اس برگ چنچ جائیں گے۔ تمہارے ملک

فرانس میں۔“

جان کی آواز تھی، انگریزی میں بات کرتے ہوئے اس کے پیچھے میز میوں پر آ رہا تھا۔ جواب میں لڑکی کچھ بولی تھی۔ ناجیہ سمجھ نہ سکی۔

اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مگر اتنا ضرور سمجھ گئی کہ وہ فریج کیہترین ہی تھی۔

جانے کیوں؟ اس کے خوبصورت چہرے پر تاریک سے سائے چھا گئے۔ آہستہ قدم چلتی وہ اپنی میز پر آ گئی۔ مسٹر اور مسز مارٹن شاید ناشتہ کر چکے تھے۔ آنٹی اور مجتبیٰ بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

وہ بیٹھ گئی۔ ناشتے کا انتظار کرنے لگی۔

نظریں غیر ارادی طور پر لاؤنج کے دروازے پر پڑیں۔

جان اور کیہترین وہیں کھڑے تھے۔ جان کچھ کہہ رہا تھا۔

کیہترین نے درمیان میں ہی آگے بڑھ کر اس کے گال پر اسے پیار کر لیا۔

جان کا ناجیہ کی طرف پہلو تھا۔ وہ اس کا رد عمل تو نہ دیکھ سکی۔ پر۔ اپنا رد عمل اسے ضرور بے چین کر گیا۔

اور پھر۔ وہ۔ حق بجانب بھی تھی۔ اتنا تو اسے جان نے سمجھا ہی دیا تھا کہ وہ اس سے پیار کرتا تھا۔

وہ بھی۔ وہ بھی اسے چاہنے لگی تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی، یہ بھی جان کو معلوم تھا۔

پھر۔ پھر۔ یہ کیا تھا؟ کل پارک میں۔ جان کی مرضی تھی یا نہیں، کیہترین تو اسے پیار پر پیار کئے جا رہی تھی نا۔ پھر واپسی میں کوچ پر آتے وقت وہ پیچھے رہ گئی تھی۔ کوئی اور بھی تو اسے ڈھونڈنے جاسکتا تھا۔

اور اب۔ اب۔ کیا ہو رہا تھا یہ سب؟ چاہتے ہوئے بھی وہ برداشت نہیں کر پار ہی تھی۔

”گڈ مورننگ“۔ جان خوش خوش اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

”ہیلو“۔ وہ بمشکل بولی۔

جان اس کا لب و لہجہ بھانپ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل کیہ ترین سے بات کرتے ہوئے اس نے اسے کنکھیوں سے اپنی طرف دیکھتے بھی دیکھا تھا۔ وہ اس کی جھکی پلکوں کو دیکھنے لگا۔

”سوئیں پھر بعد میں؟“

اس نے جھکی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بس۔

گلابی، زعفرانی، سرخ، سنہری دھند چھائی تھی وہاں۔

ادہ — کتنی Possessive تھی۔ اسے اچھا سا لگا۔

”نیند نہیں آئی؟“

گلابی، زعفرانی، سرخ سنہری دھند بھیگ گئی۔

کتنا چاہنے لگی تھی اسے — وہ مسور سا ہو گیا۔

”صبح صبح اجنڑ کے شور نے سونے نہیں دیا؟“

شرقی رنگوں کے موتی لڑھک کر اس کے خوبصورت گالوں پر آ رہے۔

وہ شرارت بھول بھال گیا۔ جلدی سے بڑھ کر دونوں موتی نیپکن میں جذب

ر لئے۔

”سوری۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا“۔ وہ واقعی نادم لگ رہا تھا۔

ویٹریس دونوں کا ناشتہ لگا رہی تھی۔

وہ تاجیہ کے جھکے سر کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ کچھ مطمئن سی نظر آنے لگی تھی۔

خالی ٹرے لئے ویٹریس واپس چل دی۔

”بہت غصہ آیا تھا۔؟“ وہ حسب عادت جوس کے بڑے بڑے گھونٹ لینے لگا۔

جھکی پلکیں اٹھا کر تاجیہ نے اسے دیکھا، چپ چاپ۔ بھیگ کر اس کی آنکھوں

کے شرعی رنگ بہت واضح ہو گئے تھے۔

”کتنے بہت سے خوبصورت رنگ ہیں تمہاری آنکھوں میں — شربت جیسے،

شراب جیسے۔“ وہ کچھ حیرت سے، کچھ معصومیت سے بولا۔
 ارغوانی رنگ ایک بار پھر اکٹھے ہوئے۔ موتی بننے لگے۔
 اسے اچانک ہینرل نٹ یاد آ گئے۔ ہینرل کی جھاڑیوں میں لگے سرخی مائل
 بادامی نٹ۔

”تمہارا نام تو ہینرل ہونا چاہئے تھا۔“
 پلکیں جھپکیں۔

”اوں—ہوں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا جوس کا گلاس آگے بڑھایا۔
 ”اس میں چھلکاؤ۔ نیچے نہیں گرانا۔“

اور—نہ چاہتے ہوئے بھی ناجیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔
 جان نے باقی کا جوس بھی پی لیا۔ خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔
 ”تو—بہت غصہ آیا تھا—ہاں۔“ وہ ٹوسٹ پر مکھن لگانے لگا۔
 ”کیا کہہ رہی تھی؟“ اپنا جوس اٹھائے ہوئے ناجیہ نے اچانک سوال کر
 دیا۔

جان کا ہاتھ رک گیا۔ ایک ہل کو کچھ سوچا۔
 دو ایک بار زور سے پلکیں جھپکیں۔ کنکھار کر گلہ صاف کیا۔
 ”کوئی خاص نہیں۔ بس...“
 ناجیہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔
 ”بس کیا؟“

”یہی کہ— آج کوچ میں وہ میرے پاس—یا—میں—اس کے پاس
 بیٹھوں۔“

ناجیہ چپ سی رہ گئی۔

”میں نے— منع کر دیا۔“

اس کے لب و لہجہ پر نہ چاہتے ہوئے بھی ناجیہ کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”اور کیا کہتی تھی؟“

اسے مسکراتا دیکھ کر وہ ہنس دیا۔

”ایک Kiss مانگ رہی تھی اور بس۔“ وہ لاپرواہی سے بولا۔

ناجیہ کا چہرہ تاریکیوں کی زد میں آ گیا۔

”آپ مانگ رہے تھے یا وہ مانگ رہی تھی؟“

اوپر۔ اس نے دیکھا تو تھما سب۔ لینے کے دینے پڑ گئے تھے یہاں تو۔

”میں مانگ رہا تھا بس۔“ وہ گڑبڑا کر بولا۔ ”اب ناشتہ کرو پلیز۔“

”آپ۔ Kiss مانگ رہے تھے۔ اس سے؟“

وہ پھیلی پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اور۔ جان کو اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا

اچانک بڑے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”Kiss بھی کوئی مانگنے کی چیز ہے۔“

ناجیہ گھبرا کر پلکیں جھپکنے لگی۔

”لیکن۔ اس نے دیا تو تھا۔“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

جان محفوظ سا ہوا۔

”وہ تو وہ کل پارک میں بھی دے رہی تھی۔“ وہ اپنے ناشتے کی طرف

متوجہ ہوا۔

ناجیہ کے خوبصورت چہرے کو پھر سایوں نے آن گھیرا۔

شرقی بلوروں کی کرچیاں ہونے لگیں۔

”میں نے دیکھا تھا۔“

”اسے کہتے ہیں یورپ۔ تمہیں زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ سنجیدگی

سے ناشتہ کر رہا تھا۔

ناجیہ سے اور برداشت نہ ہوا۔ ناشتہ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھو پلیز۔“ جان نے جلدی سے اسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ ”میں مذاق کر رہا تھا۔“

وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔ پھر سے ناشتہ کرنے لگی۔
 ”کل... وہ کہاں رہ گئی تھی؟“ ناجیہ جیسے نہ چاہتے ہوئے بھی سب جاننا چاہتی تھی۔

”کل — کس وقت؟“ کاٹنا پلیٹ میں رکھ کر وہ اسے دیکھنے لگا۔

”جب ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ وہ کوچ میں نہیں آئی تھی۔“

”اوہ — اوہ — اوہ —“ وہ بے اختیار ہنس دیا۔

ناجیہ کو اس کی ہنسی اچھی نہیں لگی۔

”وہ — پتہ ہے وہ کہاں تھی؟“

وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

”وہ — وہیں تھی — قریبی درختوں کو اوٹ میں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ — کہ اسے یقین تھا اسے ڈھونڈنے میں ہی آؤنگا۔ وہ جان

بوجھ کر وہاں ایک طرف چھپ گئی تھی۔“ گو اب کے اس نے سچ کہا تھا۔

مگر پھر بھی ناجیہ کی آنکھوں میں دیکھ دیکھ کر جیسے اسے چڑا رہا تھا۔

”اور... آپ بھی... جان بوجھ کر اسے ڈھونڈنے گئے تھے۔ کوئی اور نہیں

جاسکتا تھا اسے ڈھونڈنے۔“

”ہاں شاید۔“

اور — ناجیہ اپنے آنسو بمشکل چھپاتی وہاں سے چلی آئی۔

جان — ناشتہ چھوڑ چھاڑ — اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

بیڑھیاں اترتی وہ سیدھی اپنے کیمین میں گئی۔

جان بھی پہنچ چکا تھا۔ مگر قبل اس کے کہ آگے بڑھ کر اسے جا لیتا۔ دھڑام سے اس نے دروازہ بند کر دیا۔

ان کے پاسپورٹس رات ڈنر پر ہی جمع کر لئے گئے تھے۔
 آج وہ لوگ فرانس کی سرحد میں داخل ہونے والے تھے۔ وہیں کسٹم آفیشلو کو ان کے پاسپورٹ دکھائے جانے تھے۔
 ناجیہ کچھ دیر اپنے کیمین میں رہی۔ پھر آنٹی کے پاس ان کے کیمین میں چلی گئی۔
 کبھی ان سے گپ شپ کرتی، کبھی کل کا شروع کیا ہوا ناول پڑھنا شروع کر دیتی۔
 پھر مجتبیٰ آ گیا۔
 ”مجتبیٰ بھائی آپ آج کل کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ اس نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

”آئے تو تھے آپ کے پاس۔“ اس نے ایک سرسری نظر آئینے کے سامنے کنگھی کرتی ماما پر ڈالی۔ ”کسی قابل ہی نہیں سمجھا آپ نے۔“ وہ ادا اس سا مسکرایا۔
 ناجیہ کچھ شٹاسی گئی۔

”مہ پارہ تو بہت پیاری لڑکی ہے مجتبیٰ بھائی۔“
 ”پیاری لڑکیاں تو بہت مل جاتی ہیں۔ شریک زندگی صرف وہی ہونی چاہئے جو دل کو بھا جائے۔“ کھڑکی سے باہر خلاؤں میں گھورتے ہوئے وہ جیسے اپنے آپ سے بولا۔

آج تو وہ بہت سنجیدہ تھا، ادا اس سا بھی۔
 ”ہم بہر حال۔“ اندر رخ کرتے ہوئے وہ اسے دیکھنے لگا۔ اسی میں خوش ہیں جس میں تم خوش ہو۔“

وہ گھبرا اسی گئی۔ اس کا اشارہ کہیں جان کی طرف تو نہیں تھا؟
 ”ٹھیک؟“ وہ اب بھی اس سے مخاطب تھا۔

”چلو دونوں۔ لنچ کا ٹائم ہو چکا ہے۔“ اچانک آنٹی بولیں۔

اور وہ تینوں اوپر لاؤنج کی طرف چل دیئے۔

”مس ناجیہ احمد تشریف لارہی ہیں۔“ بار کے سرے پر کونے والی میز پر بیٹھا

پرویز جان سے مخاطب ہوا۔

جان نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

چپ چپ سا چہرہ، جھکی جھکی نظریں لئے وہ اپنی میز کی طرف بڑھ رہی تھی۔

کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے ایک سرسری نظر اس طرف ڈالی تھی۔

مگر۔۔۔ جوں ہی جان سے آنکھیں چار ہوئیں۔ نظریں جھکالی تھیں۔ چپ

چپ سے چہرے پر کچھ اور بھی آثار نظر آنے لگے تھے۔

غصہ کے شاید۔۔۔ خفگی کے غالباً۔

جان ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

”خفا ہے مجھ سے۔“

”کس بات پر؟“

”صبح کی سترین کو میرے ساتھ بات کرتے دیکھ لیا تھا۔“

”وہ صرف بات کرتی ہے؟“ پرویز اسے دیکھنے لگا۔ ”کل بیدن بیدن کے

پارک میں نے بھی اسے تمہارے پاس دیکھا تھا۔ اور یہ بھی دیکھا تھا کہ کچھ فاصلے

پر بیٹھی ناجیہ تم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔“

”یار اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”بہر حال۔۔۔ یہ سب پاکستانی لڑکی کیساتھ نہیں چلے گا۔ بلکہ کسی یورپین لڑکی

کے سامنے اگر ایسا ہوا تو وہ یوں خاموش نہیں بیٹھی رہے گی۔ تمہیں معلوم ہے اچھی

طرح۔“

”اچھا اچھا آئندہ نہیں ہوگا ایسا۔“

”مجھ سے کیا کہتے ہو۔ جا کر ناجیہ سے کہو۔“

”کہا تو تھا۔ لیکن۔۔“

”لیکن کیا؟“

پھر اسے چھیڑنے کو دل کرتا ہے۔ پھر کیتھرین کا ذکر لے بیٹھتا۔ بس خفا ہو گئی۔
اور۔ اور۔۔“ اسے اچانک اس کی نم آنکھیں یاد آ گئیں۔ ”جسہیں پیہ ہے اس
کی آنکھوں کا رنگ کیا ہے؟“

”جیسے بہت سے روشن چمکیلے۔ گلابی، زعفرانی، سرخ، سنہری رنگ ہر وقت
آپس میں گڈمڈ ہو رہے ہوں۔ اور پھر روئی تو لگا۔ گلابی، زعفرانی شربت۔ سرخ
’سنہری شراب چھلکنے لگی ہے۔‘

”واہ۔ تم تو شاعر ہو گئے۔“

”ہائے گوڈ۔ بالکل یہی رنگ ہیں اس کی آنکھوں میں۔“

”ہوں۔ تو خفا ہے تم سے۔“

”بہت۔“

”میں مناتا ہوں جا کر۔“ پرویز نے اپنی پلیٹ اٹھائی۔ اور قبل اس کے

کے جان روک پاتا۔ وہ سیدھا پہنچا تاجیہ کی میز پر۔

جان منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔

کانٹا ہاتھ میں لئے اسی طرف دیکھتا رہا۔

خشمگیں نظروں سے، جھنجھلایا، جھنجھلایا سا۔

اس نے دیکھا پرویز نے کچھ ایسا تاجیہ کو باتوں میں لگا لیا تھا کہ — کچھ دیر

قبل کا اس کے چہرے پر چھایا غصہ اور خفگی بھی دور ہو گئی تھی۔

وہ پھر سے بے کل ہو گیا۔

دو چار نوالے لئے۔ ہاتھ نیپکن سے صاف کیا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

معا پرویز کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اور پیچھے مڑتے ہوئے وہ جان کو دیکھنے

ڈانٹنگ سیکشن میں میزوں کے بچوں بچے راستے پر چلتے چلتے وہ رک گیا۔
 ”میں نے کیا کہا تھا یاد ہے؟“ جان ان سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا اسے
 تاجیہ کو نہ اچکنے کی بات یاد دلارہا تھا۔

”مجھے کچھ یاد نہیں۔“ پرویز لا پرواہی سے بولا۔

”I'll throw you in the river.“

تاجیہ ان کا جھگڑا نہیں سمجھ پارہی تھی۔ مگر پھر بھی جانے کیوں اسے ہنسی آ گئی۔
 شپ اونز تھا۔ لوگوں کو دریا میں نہ پھینکتا تو اور کیا کرتا؟
 ”میں تیر کر واپس آ جاؤں گا۔“

”سمجھ لوں گا تمہیں۔“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا وہ اوپر ڈیک کی سیڑھیاں
 چڑھنے لگا۔

کھانے کے بعد آٹنی تاجیہ کو ساتھ لے کر اوپر ڈیک پر آگئیں کیپٹن زکوارٹرز
 کے اس طرف فولڈنگ چیئر پر بیٹھی مسز براؤن نظر آ رہی تھیں۔ وہ لوگ اسی طرف
 بڑھیں۔ وہیں مسز براؤن کے مقابل کوارٹرز کی اوٹ میں جان بھی کرسی پر بیٹھا
 ان سے باتوں میں مصروف تھا۔

آٹنی کو آتے دیکھ کر اس نے اپنی کرسی ان کے لئے چھوڑ دی۔ خود قریبی خالی
 کرسی چھٹیٹ لایا۔

تاجیہ نزدیک ہی ریلنگ کے پاس بیٹھ گئی۔

شپ اپنے مخصوص انداز میں چلا جا رہا تھا۔ پانی کی لہریں شپ کے ڈھانچے
 سے ٹکراتی مخصوص شور مچا رہی تھیں۔

اس کی نظریں کناروں پر پڑیں۔

کسی بھی قسم کے لباس سے مبرا، کوئی بیٹھی، تو کوئی لیٹی، کئی فرانسیسی خواتین نظر
 آئیں۔ نہانے کے بعد دھوپ لے رہی تھیں۔ شاید۔

تاجیہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ یکدم ہی رخ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”Look at them.“ - مسز براؤن حقارت سے گویا ہوئیں۔

”میرا بس چلے تو انہیں دریا میں پھینک دوں۔“

جان دھیرے سے مسکرا دیا۔

”ابھی چند روز قبل برٹشکم میں شام کے وقت میں نے اپنے فلیٹ کی کھڑکی کا

پردہ سرکایا تو دیکھا دونو جوان جوڑے میرے فلیٹ کے آگے فٹ پاتھ پر کھڑے

بڑے اطمینان سے بوس و کنار میں مصروف تھے۔“ مسز انگریز مسز براؤن پھر کہہ

رہی تھیں۔ ”مجھے اس قدر غصہ آیا دل میں آیا پانی سے بھری بالٹی اوپر سے انڈیل

دوں۔ کم از کم مجھے اس قسم کی حرکتیں سخت ناپسند ہیں میں نے پولیس کو فون کر کے

مطلع کرنا چاہا۔ میں نے پکڑوا لیتا تھا۔ مگر میری بیٹی آڑے آگئی۔ کہ خواہ مخواہ کا

شور مچے گا۔ جوانی ہم پر بھی گزری ہے۔ بلکہ میں تو آج بھی گھر سے باہر جاتے

ہوئے دستانے پہننا نہیں بھولتی۔“

رخ دوسری طرف ہوتے ہوئے بھی ناجیہ کو ہنسی آگئی۔

ٹانگیں بے شک نظر آئیں۔ مگر ہاتھوں پر دستانے ضرور ہوں۔ کیا منطق تھی!

مگر۔ ہر قوم کی ہر پرانی نسل تقریباً ایک سی ہوتی ہے۔ اسے ماننا پڑا۔

اور۔ مسز براؤن کے خیالات کی اسے قدر بھی ہوئی۔

”And these French women.“ فرنیچ لوگوں کے لئے ان

کی حقارت ان کے لہجے سے عیاں تھی۔ ”پچھلے سال لنڈن میں میں وکٹوریہ شیشن

پر ایک کیو میں کھڑی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ کہ اچانک ایک فرنیچ لڑکی آ

کر قطار میں میرے آگے آکھڑی ہوئی۔ اووف۔۔۔“ انہوں نے غصے میں دانت

پیسے۔ ”میں نے اسے بازو سے پکڑا اور سیدھا لے جا کر کیو کے آخر میں کھڑا کر

دیا۔ رونے لگی۔ ہونہ۔ میں نے کہا۔ ”یہ انگلینڈ ہے مائے ڈیئر۔ ہر کام

قاعدے اور قانون سے ہوتا ہے۔“

ہر ملک ہر قوم میں کپ باز لوگ موجود ہیں۔ حسد بھی کرتے ہیں۔ یہ ناجیہ کو

بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

”you are right.“ اچانک جان کی آواز آئی۔

غیر ارادی طور پر ناجیہ نے رخ ان کی طرف کر لیا۔

جان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ دلنشین آنکھوں میں شوخ چمک تھی۔ پرکشش لبوں پر شریہ تبسم کھیل رہا تھا۔

کہاں ان کے طور طریقے اور کہاں انگریزوں کے۔ ایسٹو کر لسی رگ رگ میں بھری ہے آپ لوگوں کے تو۔“

معمر انگریز خاتون کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔

جان واقعی انگریزوں سے متاثر تھا یا نہیں۔ فرنج لوگوں کے طور طریقوں میں درحقیقت کوئی کمی تھی یا نہیں۔ مگر۔ ناجیہ اتنا ضرور جان گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی شوخی سے، اس کے شریہ تبسم سے۔ کہ جہاں وہ انگریز مسز براؤن کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں خوش کر رہا تھا۔

وہاں۔ ناجیہ کو بھی فرنج کی سترین کی طرف اشارہ کر کے پھینٹ رہا تھا۔

”ابھی پچھلے دنوں۔۔۔ یٹل شپ پر۔“ وہ ناجیہ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”ایک فرنج لڑکی مجھے بتا رہی تھی۔ کہ ہم فرنج لوگوں میں اور انگریزوں میں یہ فرق ہے۔ کہ ہم جب اور جس کے گھر چاہیں بغیر اطلاع کئے بلا تکلف چلے جاتے ہیں۔ اور انگریز۔۔۔ وہ لوگ بغیر مدعو کئے۔ بغیر ٹائم لئے کہیں نہیں جاتے۔۔۔“

”very true very true.“ مسز براؤن اس کی بات کاٹتے ہوئے

بے تحاشہ خوش ہو کر بولیں۔

”جبکہ حقیقت یہ ہے کہ۔“ وہ آنٹی کی نظریں بجاتے ہوئے جلدی سے ناجیہ

سے مخاطب ہوا۔ ”کہ فرنج بہت مددگار بہت جلدی محل مل جانے والے مہمان نواز اور۔ اور۔۔۔ پیارے لوگ ہوتے ہیں۔“

گو جان نے اپنا مشاہدہ بتایا تھا۔

مگر۔۔۔ ناجیہ جہاں اس کی اس تمام گفتگو کا مطلب سمجھ رہی تھی۔

وہاں اس کے آخری جملے کا مطلب بھی اس سے چھپا نہ تھا۔

یہاں پھر کچھ عرصہ کی طرف اشارہ تھا۔

اس کے خوبصورت چہرے پر ایک بار پھر تاریک سائے لہرانے لگے

”اور ایک بات تمہیں اور بتاؤں“۔۔۔ منہ براؤن مسکراتے ہوئے جان سے

کہنے لگیں۔ تم ساحل پر کبھی مت اترنا۔۔۔ تم بہت ہندسہ ہو۔ فریج لڑکیاں تمہیں

چھوڑیں گی نہیں۔“

جان مسکرا دیا۔ ناجیہ پر نظر پڑی۔

اس کے چہرے کی تاریکیاں بڑھ گئی تھیں۔ اداس بھی تھی، خفا سی بھی۔

اور پھر۔۔۔ وہ وہاں سے بھی چلی آئی۔ نیچے لاؤنج میں۔

کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی وہ ایک رسالے میں محو ہو گئی۔ آخری صفحے کی

تصاویر پر نظر ڈالنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی اپنے کیمین کی طرف آنے لگی۔

سامنے ہی پرویز تھا۔ جان کے کیمین پر دستک دے رہا تھا۔

کیمین پر پہنچ کر وہ چابی سے دروازہ کھولنے لگی۔

”جان سٹراس برگ میں اتر رہا ہے“۔ ایک بار اور جان کے دروازے پر

دستک دیتے ہوئے پرویز نے پاس کھڑی ناجیہ سے کہا۔ ”تمہیں اس نے بتایا ہے؟“

ناجیہ کا رنگ خنجر گیا۔ سفید پڑ گیا۔

دل جیسے رک سا گیا۔ تھم گیا۔

پرویز نے اسے غور سے دیکھا

”تمہیں نہیں بتایا اس نے؟ ظہرو میں پوچھتا ہوں اس سے“۔

اور۔۔۔ ناجیہ کچھ بھی بولے بنا۔ جیسے اپنے وجود کو کشمشتی اپنے کیمین میں چلی

آئی۔

اور۔۔۔ بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

چند لمحے تو اسے ہر طرف خلا ہی خلا نظر آنے لگا۔

جہاں کوئی امید جیسی شے نہیں پائی جاتی تھی۔ جہاں کسی آس جیسی چیز کا گزر نہیں تھا۔

پھر۔۔۔ آہستہ آہستہ وہ ہوش میں آنے لگی۔

ایسا تو ہونا تھا۔ یہاں نہیں۔۔۔ تو بواپسی۔ جانا تو اس نے تھا ہی۔ الگ تو ہونا ہی تھا دونوں نے۔

اگرچہ کل جان نے اس سے کہا تھا وہ یہاں نہیں اترے گا۔ مگر۔۔۔ آج شاید ارادہ بدل دیا تھا۔ کوئی ضروری کام پیش آ گیا تھا غالباً۔ اور پھر۔۔۔ آج وہ رک بھی جاتا۔ تو۔۔۔

کب تک؟ کتنے دن اور ساتھ دیتا؟ پانچ۔۔۔ چھ؟
تلخی سے مسکرائی۔ تو بے شمار آنسو نکل آئے۔

”تھوڑی ہی دیر میں شپ Strasbourg میں لگنے والا ہے۔“ لاؤڈ
سپیکر پر پہلے ڈچ پھر جرمن اور آخر میں انگلش میں اعلان ہوا۔

اور۔۔۔ ناچیہ تکیوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

خداوند! یہ کیسی بے بسی ہے۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیسا درد پل گیا ہے دل میں۔

ایسا درد! ایسا دکھ۔ جس کا کسی سے ذکر بھی نہیں کر سکتی۔

اس سے بھی۔ جس نے یہ درد دیا ہے۔ اور پھر۔۔۔

اس کی نظروں میں جان کی شکل ابھر آئی۔ خلوص اور اپنائیت بھری۔

ایک بار پھر اس کے لب متبسم ہوئے۔ اداس گھائیل سا تبسم۔

جان بھی کیا کرے؟ چند دنوں کا ساتھ اتنا درد لائے گا اپنے ساتھ۔

یہ تو اس نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔

پھر۔۔۔ کیا ہوگا؟ اس کا انجام؟ ہونہ۔۔۔ دس پندرہ دنوں کے ساتھ۔

انجام ہوتا؟

سوائے دکھوں کے، دردوں کے کیا ملتا تھا؟
مگر۔۔۔ اس کی روح تک کراہ اٹھی۔ وہ یہ دکھ برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ درد اس کی وساطت سے باہر تھا۔

وہ پھر رو دی۔ بلک بلک کر رو دی۔
پاس والے کیمین کے دروازے کے بار بار کھٹنے بند ہونے پر غیر ارادی طور پر اس نے سراٹھایا۔ سامنے دیکھا۔

پریشانی میں اس نے اپنا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ ادھ کھلا تھا اب بھی۔
یونیفارم میں لمبوس سیورڈ آ جا رہا تھا۔
اور پھر۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے دیکھا۔
جان اور پرویز آگے آگے تھے۔ سیورڈ ہاتھوں میں سوٹ کیس لئے ان کے پیچھے تھا۔

جان جا رہا تھا۔ بچ بچ۔
اور۔۔۔ اٹھ کر دروازہ بند کر کے دوبارہ بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے تکیوں میں منہ دے کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اور پھر۔۔۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ آنکھ لگ گئی تھی غالباً۔
قریبی سڑک سے کوئی ٹرک گزرا تھا شاید۔ شور کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

چونک کر اس نے دیکھا۔ شام ہونے کو تھی۔
یہ سڑاں برگ ہے۔ اور۔۔۔ جان شپ چھوڑ کر جا چکا ہے۔ پہلا خیال اسے یہی آیا۔

بے جان سا جسم کھسکتی وہ کونے میں لگا پردہ ہٹا کر بیسن میں منہ دھونے لگی۔
تو لیئے سے خشک کیا۔ بالوں پر سرسری برش پھیرا۔ آنکھوں پر نظر پڑی۔ سرخ

سرخ اور سوجھی ہوئی تھیں۔

اداس سی سانس لیتے ہوئے وہ کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

شب لنگر انداز تھا۔ سٹراس برگ کے پورٹ کی بلڈنگ۔ پانی کے اس پار
ٹاؤن کی عمارتیں۔ سڑک اور سٹریٹس نظر آرہی تھیں۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔

آنٹی کی طرف چلی جائے اس نے سوچا۔ مگر وہ تو یقیناً کوچ میں سٹراس
برگ کے ٹرپ پر جا چکی ہوں گی۔

بہر حال۔ کیبن لاک کر کے وہ کوریڈور میں نکل آئی۔ پاس والے کیبن
کے بند دروازے پر نظر ڈالی۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔
بے جان قدم سنبھالتی وہ آگے بڑھنے لگی۔

شب میں خاموشی چھائی تھی۔ لوگ ٹرپ پر باہر گئے تھے۔ وہ آہستہ قدم
اٹھاتی اور پریئرمیاں چڑھنے لگی۔ لاؤنج تک پہنچی۔ نظر اندر پڑی۔ چند پنجرے
یہاں بھی تھے۔ کوئی پڑھ رہا تھا۔ کوئی پی پلارہا تھا۔ آج ڈنر بھی شاید لیٹ
تھا۔ مسافروں کی واپسی کا انتظار تھا غالباً۔

وہ اور اوپر چڑھ گئی۔ ڈیک پر۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔

شام کے سائے تلکے ہو رہے تھے۔ دریا کناروں پر کے لایے لایے درخت
تاریک ہونے لگے تھے۔ قرمبی گلیوں کے لیمپ روشن ہو چکے تھے۔ پانی میں آتی
جاتی کشتیوں کی روشنیاں شب کی روشنیوں سے ٹکراتی گزر رہی تھیں۔

دور۔ اونچے پہاڑ۔ تاریکیوں میں ڈوبنے لگے نئے۔

ریلنگ کا سہارا لئے۔ وہ دور اندھروں میں گھور رہی تھی۔ جان جا چکا
تھا۔ مگر۔ جاتے وقت اسے ملتے ہوئے تو جاسکتا تھا۔ پر۔ اس کے لبوں پر
تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔

نودس دن کی جان پہچان میں۔ کتنا دم ہو سکتا تھا؟ کیا پائیداری ہو سکتی تھی

؟ اتنی — کہ وہ جاتے وقت اسے مل کر جائے۔

مگر — مگر — اسے یہ بھی تو حق نہیں تھا۔

کہ — کہ — ان چند دنوں میں — اس کے یوں قریب چلا آیا تھا۔

اتنا کہ — وہ اُسے اپنی سانسوں تک میں بسانگئی تھی۔

لیکن — وہ چونگی — اس نے کبھی کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی — جس سے وہ

یہ اخذ کر سکے کہ وہ اسے چاہتا تھا۔ پیار کر رہا تھا۔

چاہت؟ پیار؟ وہ چونگی — ایسی تو واقعی کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

پھر؟ وہ کیوں اتنی بے بس ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی دکھی اتنی اداس۔

اس کی سوچیں اداس تھیں، اس کا رُواں رُواں اداس تھا۔

یہاں تک کہ آس پاس — ارد گرد کی فضا تک اداس تھی۔

کیا ہوگا؟ کیسے جنے گی وہ؟ اس درد کو لے کر — اس دکھ کو لے کر —

مارے بے بسی کے وہ — ایک بار پھر رو دی۔

چپ چاپ — تو اترے آنسو بہنے لگے۔

معا — پیچھے کہیں قدموں کی آہٹ ابھری۔

اس نے جلدی سے اٹھلیوں کی پوروں سے آنسو پونچھے۔

رینگ پر جھکتے ہوئے شپ کی روشنیوں میں نیچے پانی میں منعکس ہوتے اپنے

سائے کو دیکھنے لگی۔

مگر — آج تو جیسے آنسوؤں نے نہ رکنے کی قسم اٹھا رکھی تھی۔

جتنا روکنے کی کوشش کی — اتنے ہی اٹھا کر آنے لگے۔

اور پھر — اسے لگا — کوشش ضبط میں اس کی جنین نکل جائیں گی۔

منز کردہ میز میوں کی طرف بڑھنے لگی۔ نیچے کہیں میں جانے کے لئے —

قدموں کی آہٹ قریب آ رہی تھی۔

نیچے لینڈنگ سلج سے سیدھی اوپر دیک تک آئی گینگ دے پر کوئی اوپر

آ رہا تھا۔

رینگ پر سے اس کی نظر پڑی۔

شام کے تاریک سایوں میں بھی — آنے والے کے سراپے میں کسی مطلع العنان فرمانروا کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں اتھارٹی اور کمانڈ واضح طور پر بول رہے تھے۔

اس کا دل یکبارگی دھڑکا — ساتھ ہی اپنی چیخیں روکنے کو بازو منہ پر گیا۔
 ”ٹپ پر نہیں گئیں“۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

وہی مخصوص چمک آنکھوں میں لئے۔ وہی مسکور کن مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے۔

اور — ناجیہ کی ہنسی بندھ گئی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے اس کے چہرے پر سے اس کا بازو ہٹایا۔

”آپ... آپ تو چلے گئے تھے“۔ وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔
 اوہ — تو تبھی وہ اتار دوئی تھی۔

اچانک وہ اس سے اسے بہت پیاری لگی — بہت اپنی لگی۔

چند ثانیے وہ بغور اس کے بھیکے چہرے متورم بند بند آنکھوں میں دیکھتا رہا۔
 پھر — آہستہ سے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

باری باری دونوں آنکھوں پر پیار کیا۔

”کس نے بتایا میں چلا گیا تھا — ہاں۔“

”پر... ویز... بھائی... نے“۔ وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔

”مذاق کیا ہوگا اس نے۔ میں فون کرنے گیا تھا بابا جان کو۔ میں نے تو تم

سے کہا تھا نہیں جاؤں گا“۔ وہ اگلیوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

”آج نہیں گئے تو پانچ دن بعد تو جائیں گے نا۔“ آنسو پھر سے اٹھا کر اس

کے گالوں پر آنے لگے تھے۔

”اوہ“ — وہ اس کے اندیشے سمجھ گیا۔

بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔

ان گنت پیار کر ڈالے۔

”میں... میں... کیسے... کیا کروں“ — تاجیہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔ کہ کیسے اسے

اپنے درد کی گہرائی بتائیے، دکھ کی انتہا سمجھائے۔ ایسا درد جس کا مداوا مشکل تھا۔ ایسا

دکھ جس کی تلافی ممکن نہ تھی۔ مگر — پھر بھی — جانے کیوں اسے اچانک، غیر

متوقع یہاں پا کر — وہ بول ہی پڑی۔

”کیوں — کیا ہے؟“ اسے لپٹائے لپٹائے اس نے پوچھ لیا۔

تاجیہ نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

کیا وہ واقعی سمجھ نہیں رہا تھا؟

”ہوں — بتاؤ نا“ — وہ یکدم سنجیدہ تھا۔

”میں... میں...“ وہ کیا کہتی؟ کیسے کہتی؟

اس کی آنکھوں میں ہی دیکھتی رہی۔

”بولو نا“۔

تاجیہ نے انگلیوں سے آنسو پونچھے۔ ہل بھر کو کچھ سوچا۔

”میں... میں...“ اس کے پھر آنسو نکل آئے۔ سرائیک بار پھر اس کے سینے سے

جاٹکا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

اس کے لئے رو پڑتی تھی۔ اس کے سینے پر سر رکھ لیتی تھی۔

مگر — منہ سے — کچھ بھی نہ کہہ پا رہی تھی۔

”بتاؤ نا کیا ہے؟“

اور — تاجیہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ ہونٹ ہنسی کا بار اٹھانے سے قاصر لگ رہے تھے۔

اور— تاجیہ نے— بے اختیار اسے پیٹ ڈالا۔

وہ کیسے کیسے مبر آزما مرحلوں سے دو چار تھی اور— یہ کتنا مطمئن تھا، مسکرا رہا تھا۔

”کیوں مجھ سے بات کی تھی؟ میں ٹھیک ٹھاک تھی۔ خواہ مخواہ آ کر مجھ سے باتیں کیں...“

”So what“۔ وہ ہنس ہنس کر اس کے نازک وار سہتا رہا، محفوظ ہوتا رہا۔

اور— تاجیہ کو آگ ہی تو لگ گئی۔ کتنے آرام سے ہنس رہا تھا۔ کتنے اطمینان سے ’So what‘ کہا تھا۔

اس نے اپنے گرد لپٹے اس کے بازو کھول لئے۔

”ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود تو آرام سے ہیں نا“۔

جان نے جاندار تہقہ لگا لیا۔

اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے گرد لپیٹ لئے۔

”تم بے آرام ہو؟“ ایک بار پھر اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے اس نے اس کے کان کے پاس شریخی سرگوشی کی۔

تاجیہ کو جیسے کرنٹ چھو گیا۔

یکدم ہی اپنے بازو ہٹائے۔ اس کے بھی کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

جان کی گرفت مضبوط تھی، اس کے بازو نہ کھول سکی تو وہ پھر سے اسے پیٹنے لگی۔

وہ ہنستا رہا— تو اسے پھر سے رونا آ گیا۔

سر بے بسی سے اس کے سینے پر رکھتے ہوئے وہ بے اختیار رو دی۔

پیار ہو جائے تو یہ رد عمل ہوتا ہے!
 اتنا حسین، اتنا انوکھا! اتنا مسرور کن اتنا مدہوش کن!

اس کے گھنے مہکتے بالوں میں چہرہ دیئے جان بے خود سا ہو گیا۔

”I love you Na....“۔ وہ رک گیا۔ یہ نام زبان پر لانا جیسے اس

کے بس میں نہیں تھا۔ ”I love you“۔ اس کے بالوں پر پیار کرتے کرتے وہ کچھ سنبھلا۔ ”میں کہاں آرام سے ہوں۔ میں تو زندگی میں اتنا بے کل اتنا بے قرار نہیں ہوا۔ پانچ دن بعد کیا مجھے دکھ نہیں ہو گا تم سے الگ ہونے کا؟ یہی سب تو بتانے میں ابھی فون کرنے گیا تھا بابا جان کو۔ وہ فون پر نہیں مل سکے میں نے پیغام چھوڑ دیا ہے۔ یہیں ہیں وہ فرانس میں۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ مجھے تم مل گئی ہو۔ میں نے اپنی زندگی پالی ہے۔ میں ان سے کہوں گا کہ جلد ہی تمہارے ابو سے بات کر لیں فون پر، خط پر۔ جیسے بھی ممکن ہو۔ تمہیں میرا بتا دینے کی بات کر لیں....“

اور اب — ناجیہ جیسے اس کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اور وہ چہرہ اس کے سینے میں چھپائے جا رہی تھی۔

”چلو ایسا ہی ٹھیک ہے“۔ اس کے بازو ناجیہ کو گھیرے میں لئے تھے۔ اور ناجیہ انداز خود سپردگی لئے اس کے سینے سے لگی کھڑی تھی۔

جان مدہوش سا ارد گرد دیکھ رہا تھا۔

”رائین کبھی اتنا خوبصورت نہیں تھا۔ جتنا آج ہے۔ پتہ ہے کیوں؟“ اس

کے گھنے بالوں کو سہلاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

ناجیہ چپ چاپ اس کے سینے سے لگی اس کے دل کی دھڑکنیں سن رہی تھی۔

”کیا کہتا ہے۔ ہاں۔“

ہاں، ہوں۔ اس کے مخصوص الفاظ ناجیہ کو بہکا بہکا دیتے تھے۔

وہ خاموش تھی اب بھی۔ جان کا چلے جانا، اس کا اس کے لئے اداس

ہوتا، جان کا واپس آ جانا، اس کا ناجیہ سے متعلق بابا جان کو فون — اور — اس وقت اسے لپٹائے کھڑا رہتا۔ وہ تو جیسے کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ انوکھا، حسین سا۔

”بتاؤ تا“۔

اور — ناجیہ نے سراٹھائی لیا۔ وہ جو بار بار اصرار کر رہا تھا۔ بند بند آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”کیا کہتا ہے میرا دل؟“

اور — ناجیہ نے نظریں دوسری طرف کر لیں۔

تاب نہ لاسکی اس کی بولتی آنکھوں کا۔

اور — تبھی اس نے دیکھا — پرلے سرے پر مہ پارہ کھڑی تھی۔

آس پاس کی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔

”وہ... مہ پارہ ہے“۔ گھبرا کر وہ جان کے بازوؤں سے ٹکٹنے لگی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا“۔ جان ایک سرسری نظر مہ پارہ پر ڈالتے ہوئے اب

بھی اسے بازوؤں میں لئے تھا۔

”اس نے کسی سے کہہ دیا تو“۔ مارے خوف کے ناجیہ سفید پڑ گئی تھی۔

”تم میری ہو شپ میرا ہے۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں۔“

”اس نے مجتبیٰ بھائی کو بتا دیا تو۔“ ناجیہ نے اس کے بازو الگ کر ہی لئے۔

”اوہ۔“ ایک ہل کو جیسے اسے بھی خیال آ ہی گیا۔ مہ پارہ ان دنوں اکثر

مجتبیٰ کے ساتھ نظر آئی تھی۔ ”کوئی فکر مت کرو مجتبیٰ کو جب معلوم ہو گا کہ ہم باقاعدہ

ایک دوسرے کے بننے والے ہیں۔ تو پھر۔ اسے بھی اتنا عجیب نہیں لگے گا

۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”مگر۔ مجھے ان سے شرم آئے گی۔“ رینگ پر جھکتے ہوئے ناجیہ آہستہ

سے بولی۔

”میرے پاس آ کر چھپ جانا“۔ وہ اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔

اور تاجیہ مہ پارہ سے گھبراہٹ کی جارہی تھی۔

”اچھا میں جاتی ہوں۔“

”کہاں؟“ اُس نے جاتی تاجیہ کو بالوں سے کھینچا۔

”نیچے۔ اور کہاں۔“

”آؤ تمہیں سٹراس برگ کا چکر لگوا دوں۔“

”آپ ہی کی وجہ سے مس ہوا ہے میرا ٹرپ۔“ اس کے لہجے میں شکایت

ابھر آئی۔

”اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔ آؤ۔“

”اس وقت۔ آپ کے ساتھ۔ میری امی کو پتہ چلا تو مار ڈالیں گی۔“ وہ

مسکراتے ہوئے بولی۔

”کون بتائے گا؟“

”میں۔“

”اپنی امی کو ہر بات بتا دیتی ہو۔“

”ہاں۔“

”یہ تو مشکل کر دی۔ اچھا سنو۔ زبانی تمہارا تعارف کرواتا ہوں سٹراس

برگ سے۔“

”نہیں بس۔“ وہ سمجھتی تھی اس بہانے وہ اسے روکنا چاہتا تھا۔

”سیر۔ سلی، کوئی مذاق نہیں ہوگا۔“

”اچھا۔“ اور وہ واقعی رک گئی۔

”کوچ جس راستے سے ان لوگوں کو لے کر گئی ہوگی۔ سب سے پہلے آیا ہوگا تھمڈرل۔“

”With its Holland's famous Astronomical clock.“ اچانک وہ

کوریر کی مہین آواز اور عظام انگلش میں بولا۔

تاجیہ بے ساختہ ہنس دی۔

”اور جس علاقے سے یہ لوگ گزرے ہوں گے“۔ وہ اپنی آواز میں کہنے لگا۔ ”یہ ستر اس برگ کا ایک قدیم حصہ ہے۔ اس کو Petite France کہتے ہیں۔ پھر یونیورسٹی نظر آتی ہے۔ اور پھر وہ عمارت جہاں یورپ کی کونسل اکٹھی ہوتی ہے۔ پھر کوچ گزری ہوگی مشہور Orangerte Park کے پھولوں سے بھرے باغات کے پاس سے۔ And that's all“ آخر میں اس نے پھر اپنے شپ کی ڈچ کوریئر کی آواز نکالی۔

کیا آدمی تھا۔ تاجیہ ہنسے بیٹا نہ رہ سکی۔

”اب جاؤں؟“

”میں بھی چلتا ہوں۔“

”کیا ضرورت ہے۔“

”روڈ کی پھر۔“

اور۔ تاجیہ ہنس دی۔

اسے کندھے سے تھامے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

دفعتاً سامنے پورٹ کی طرف آنے والی سڑک پر گاڑی کی بتیاں نظر آئیں۔

”کوچ واپس آگئی ہے۔“

اور پھر۔ نیچے لاؤنج کی سیڑھیاں اترتے ہی ڈنر گومک ہونے لگا۔

”چلو ٹیبل پر۔“ جان نے کہا۔

جتنی دیر وہ اس کے پاس رہتی وہ خوش رہتا۔

بجائے نیچے کیمین کے۔ اب وہ بھی میز کی طرف جانے لگی۔

”یہاں نہیں۔ وہاں۔“ وہ اسے کونے والی اپنی مخصوص میز کی طرف لے

جانے لگا۔

پنجرز لائونج میں آنے لگے تھے۔ طرح طرح کی بولیاں، ہنسی، قہقہے۔
شب کی جیسے زندگی لوٹ آئی تھی۔

”ویسے۔ آپ کو کیوں ہماری ٹیبل پر رکھا گیا ہے؟“ کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے
جیسے تاجیہ کو خیال آیا۔

وہ تو۔ کہیں بھی بیٹھ سکتا تھا۔ یہاں اس کو نے میں۔ نیچے اپنے کیبن میں۔
وہ مسکرا دیا۔

”میں شب پر صرف سستانے نہیں آتا۔ پنجرز میں گھل مل کر ان کے پرابلز
بھی جاننے پڑتے ہیں۔“

”ادہ“۔ تو جیسی وہ کبھی ان کی میز پر، کبھی اوپر ٹیک پر، کبھی یہاں کبھی وہاں
کسی نہ کسی پنجرز سے بات کرتا نظر آتا تھا۔

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں اپنے علیحدہ سویٹ میں کیوں نہیں رہتا۔ پنجرز
کے کیبن میں کیوں رہ رہا ہوں؟“

تو۔ اس کا علیحدہ بھی کوئی سویٹ تھا؟ یہ تو کبھی اس نے خیال ہی نہیں کیا
تھا۔

”کیوں رہ رہے ہیں؟“ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”ظاہر ہے۔“ پنجرز میں گھل مل کر رہنے کے لئے۔ اس نے کہا

چاہا۔ مگر پھر رک گیا۔ دلنشین آنکھوں میں شوخی اٹھ آئی۔ پرکشش ہونٹوں پر
شریر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ”تمہیں تفصیل سے سٹڈی کرنے۔“

اس کی بظاہر سادہ سی بات کو اس کی آنکھوں کی شوخی، لبوں کی شریر مسکراہٹ
بڑا ذوقنی بنا رہے تھے۔

تاجیہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ پلکیں یکبارگی جھک گئیں۔

جان محفوظ ہوئے بتانا نہ سکا۔

ویٹر بس دونوں کے سامنے کھانا لگا کر واپس جا رہی تھی۔

”پرویز بھائی کہاں ہیں؟“ تاجیہ نے اس کی نظروں کی تپش سے بچنے کی
خاطرات کا رخ بدلتے ہوئے ایک بار پھر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ دراصل وہ اتر گیا ہے۔ میں نہیں۔“ جان خوشگوار سے بولا۔
”تو... وہ... سوٹ کیس... ان کے تھے۔“

”اور مجھے یقین ہے سوٹ کیس دیکھ کر ہی تم نے رونا شروع کر دیا تھا۔“
جان کا جاندار تھمہ بلند ہوا۔

تاجیہ جھل سی اپنے سامنے خالی پلیٹ کو تکتے لگی۔
”اور۔۔۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کیتھرین بھی گئی۔“
”ہج۔۔۔ ہج۔۔۔“

”افسوس تو مجھے بھی ہے پر... پر۔“ اچانک اس کی نظریں سامنے دروازے
کی طرف ٹک سی گئیں۔ ”پر۔“ اس کی نظریں واپس تاجیہ پر آ گئیں۔ قدرے
کنکھارا۔ ”کیا کروں۔ تمہاری طرح۔ روتو۔ نہیں سکتا۔“
اور۔ اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے۔ تاجیہ اس کی گڑبڑا ہٹ
جان گئی۔

کیتھرین تھی۔ ڈنر کے لئے اندر داخل ہوئی تھی۔

تو۔ وہ جان بوجھ کر ایسا بولا تھا۔

تاجیہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

اور۔ مسکین سی شکل بنا کر۔ جان نے اتنے خوبصورت انداز میں کندھے
اچکائے۔ کہ نہ چاہتے ہوئے بھی تاجیہ مسکرا دی۔

”محبت میں دل بڑا رکھنا پڑتا ہے۔“ کھانا شروع کرتے ہوئے وہ بڑی
فراخ دلی سے بولا۔

”اپنے متعلق کیا خیال ہے؟“

خود تو وہ پرویز سے بھی جلتا تھا۔

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

”مرد کی بات اور ہوتی ہے۔“

”کیسے اور ہوتی ہے؟“

جیسی کے ساتھ ساتھ اس کی عزت کی بھی بات ہوتی ہے۔ اس کے غیرت کی

بھی بات ہوتی ہے۔“

”دوسرے لفظوں میں مرد عورت کو اپنی اور صرف اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔“

”ظاہر ہے۔“

”پھر عورت ایسا کیوں نہیں سمجھ سکتی۔“

جان نے ہاتھ روک لئے۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”سمجھتی تو ہے۔ شروع دن سے سمجھ رہی ہے۔“

اور — ناجیہ کی پلکیں جھک گئیں۔

آہستہ آہستہ کھانا کھانے لگی۔

”مجھے یہ بالکل اچھی نہیں لگتی۔“ پلیٹ پر نظریں جمائے ناجیہ دھیرے سے

بولی۔

”مجھے بھی اچھی نہیں لگتی۔“ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کو بہت اچھی لگتی ہے۔“

اور جان زور زور سے ہنسنے لگا۔

”کرٹسی ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔“

”پر دین بھائی بھی تو مجھ سے کرٹسی ہی کی وجہ سے بات کرتے تھے۔“

”تم اچھی خاصی جرح کر لیتی ہو۔ تمہیں وکیل ہونا چاہئے تھا۔“

”آپ بات کو ٹال رہے ہیں۔“

”نہیں۔ بلکہ میں تو یہ تصور کر کے کہ تم وکیل ہوتیں تو میں کورٹ میں موجود

سب لوگوں کی آنکھوں پر اپنی باندھ دیتا — سوائے اپنے۔۔۔“

”کیوں؟“ اسے ہنسی آگئی۔

”میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہیں کوئی اور بھی دیکھے سوائے میرے۔“

”بس میں بھی نہیں دیکھ سکتی کہ آپ سے کوئی اور بات کرے...“

”سوائے کیہترین کے۔“

اور—ناجیہ اٹھنے لگی۔

”نہیں پلیز۔“ اس نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے بٹھالیا۔

”آپ اس سے بات نہیں کریں گے۔“

”نہیں کروں گا۔“

”وہ بھی نہیں کرے گی۔“

”اس کا میں وعدہ نہیں کر سکتا۔“ اس نے لیمیڈ کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

اور جب گلاس واپس میز پر رکھا۔

تو—ناجیہ جا بھکی تھی۔

نیچے اتر کر وہ آنٹی کے کیمین میں گئی۔ وہیں انہوں نے اسے بتایا کہ سٹراس

برگ کے ٹرپ کے وقت وہ اسے لینے اس کے کیمین پر گئی تھیں۔ ایک دوبارہ دستک

بھی دی تھی۔ مگر کوئی جواب نہ پا کر سمجھ گئی کہ وہ سو رہی تھی۔ اس لئے جگانا

مناسب نہ سمجھ کر وہ مجتبیٰ کے ساتھ ٹرپ پر چل دی تھیں۔

اسے جان کا خیال آ گیا۔ اس نے زبانی زبانی تو سٹراس برگ کا چکر اسے

لگوا ہی دیا تھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

کتنی خوبصورت باتیں کرتا تھا۔ ڈلنشین، مسورکن۔

مگر—وہ پھر سے بے چین ہو گئی۔ کیہترین کا ذکر وہ ضرور کرتا تھا۔ اسے

تک کرنے کو ہی—مگر پتہ نہیں کیوں—اسے اس کا ذکر تک سننا پسند نہیں تھا۔

کافی دیر تک وہ آنٹی سے باتیں کرتی رہی۔ مجتبیٰ حسب معمول ڈنر کے بعد

مہ پارہ کے ساتھ کہیں باہر تھا۔ بندرگاہ کے آس پاس۔ یا پھر شہر میں۔
 حسب سابق آنٹی کی ٹامگ پر مالش کرنے کے بعد انہیں کمبل اوڑھا کر
 'شب بخیر' کہتے ہوئے وہ ان کے کیبن سے نکل کر اپنے کیبن کی طرف گئی۔
 اندر جا کر۔ جتی جلائی اور تھکی تھکی سی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ سراس
 برگ کا پورٹ روشنیوں سے منور تھا۔ دور ٹاؤن کے گلی کوچے، عمارتیں روشن
 تھیں۔

نظریں آس پاس بھٹکتی نیچے پانیوں پر آنکلیں۔
 وہاں اندھیرا تھا، پانی سیاہ تھا۔ اس کا دل دھڑک سا اٹھا۔
 انجانے اندیشوں کے مارے۔ انجانے دوسووں کے مارے۔
 معاً اس کے کیبن کا ادھ کھلا دروازہ زور سے کھلا۔
 اور۔۔۔ گھبرایا، گڑبڑایا جان۔ اس کے پاس ہی دھڑام سے کھلی کھڑکی پر
 آ رہا۔

وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بمشکل کہہ پایا۔
 "کیا ہوا؟" ناجیہ پریشان ہوئی۔
 "وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ کیسے تھیں۔۔۔" وہ بے ترتیب سانس لیتا خوفزدہ سا کوریڈور کی
 طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

اور۔۔۔ دو قدم چل کر۔۔۔ ناجیہ نے کھلے دروازے میں سے دیکھا۔
 کیسے تھیں کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا۔
 مڑ کر اس نے جان کی طرف دیکھا۔
 کھڑکی میں کھڑا قریبی میز سے کتاب اٹھائے وہ بے نیازی سے صفحہ الٹ
 پلٹ کر رہا تھا۔

تو۔۔۔ اس کے کیبن میں آنے کا، اسے منانے کا۔ اس نے یہ راستہ نکالا تھا۔
 نہ چاہتے ہوئے بھی۔۔۔ اسے اس کی چند لمبے پہلے کی مصنوعی گھبراہٹ، گڑ

بڑا ہٹ۔ اور دھڑام سے اس کے پاس ہی کھڑکی میں آگرنے پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

”یہ۔۔۔ دروازہ بند کر دو۔۔۔ وہ آجائے گی۔“ کتاب میز پر واپس رکھتے ہوئے وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہ اتنا بڑا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ وہیں کھڑی کہنے لگی۔
 ”پہلے دروازہ بند کر دو۔ پھر بتاؤں گا۔“ اسے کوریڈور میں سے آتے جاتے لوگوں کا خیال تھا۔

”نہیں پہلے بات بتائیں۔“

جان نے گہری سانس لی۔ دو قدم آگے بڑھا۔

بوٹ کی ٹو سے دروازہ دھکیلا۔

اور۔۔۔ پلٹ کر اس کے قریب چلا آیا۔

”یوں چھوڑ کر کیوں آجاتی ہو۔۔۔ ہاں؟“ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے دھیرے سے ہونٹوں سے چھوا۔

چند ثانیے وہ چپ رہی۔ اس کا انداز ہی ایسا تھا۔

”آپ... کیوں اسی کی باتیں کرتے ہیں۔“ اس نے کہہ ہی دیا۔

”پھر نہیں کروں گا۔“

”آپ... کرتے ہیں۔“

”نہیں کروں گا۔“ اس کی آنکھوں میں یقین دہانی تھی۔

وہ مسکرا دی، مطمئن سی۔ مگر ساتھ ہی جانے کیوں اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

”Be A good girl.“ اس نے دوبارہ اس کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ

رکھ دیئے۔ ”اور۔۔۔ مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ پلیز۔۔۔ ورنہ۔۔۔ اس بار میں بیچ

نہیں پاؤں گا۔ مرجاؤں گا۔“ اس کی آواز بھاری سی ہو رہی تھی۔

لبے میں جہاں بھر کا درخت تھا۔ لاغنتابی دکھ ابھرا آئے تھے۔

پھر — وہ مڑا — دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

”مجھے چھوڑ کر مت جانا — پلیز — ورنہ — اس بار — میں بچ نہیں پاؤں
 گا‘ مر جاؤں گا“۔

”... اس بار — میں بچ نہیں پاؤں گا‘ مر جاؤں گا۔“
 ”... اس بار... اس بار... اس بار...“ اس کے گھائیل دل کی کراہ تھی
 جیسے۔

دو ہی لفظوں میں جیسے اس نے اپنے دکھ بھرے ماضی کا سارا درد تاجیہ کے دل
 میں منتقل کر دیا تھا۔

”ٹن — ٹن — ٹن“۔ دور کہیں کلاک نے صبح کے تین بجائے تھے۔
 افسردگی سے سانس لیتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی — تو محسوس ہوا۔ اس
 کی آنکھیں اب بھی نم تھیں — اور —
 غور کیا — تو پاس والے کیمین کا کیمین بھی۔
 آج پھر جاگ رہا تھا — کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا۔

صبح ہی صبح دستک پر وہ جاگ اٹھی۔ بختی تھا۔ آنٹی نے بھیجا تھا اسے جگانے کو۔ آج ہی ان لوگوں نے بس سے سوئٹزر لینڈ جانا تھا۔ کئی گھنٹوں کا سفر تھا۔ کئی سرحدیں پار کرنی تھیں، کئی ممالک کی سیر کرنی تھی۔ اور — رات کو واپس بھی پہنچنا تھا۔

وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ ڈرنی گرین شلوار قمیض پر گرے موہیر کا سویٹر پہنا۔ کپڑوں کا ہمرنگ دوپٹہ لیا۔ گرے لیدر کے شوز پہنے — اور ہینڈ بیگ میں ضروری چیزیں ٹھوستی، کندھے سے لٹکاتی، کیبن لاک کرتی آنٹی کی طرف آ گئی۔

ناشتہ کرتے ہی سب لوگ نیچے کھڑی کوچ میں بیٹھنے لگے۔

پچھلی سیٹوں میں سے ایک پر وہ اور آئی بھی بیٹھ گئیں۔
 اگلی سیٹوں میں مجتبیٰ اور مد پارہ حسب معمول اس وقت بھی اکٹھے بیٹھے تھے۔
 سب سے آخر میں جان اندر داخل ہوا۔ کوریئر اور ڈرائیور جیسے اسی کے منتظر
 تھے۔ آگے بڑھ کر کوریئر نے اس سے ڈچ زبان میں کچھ کہا۔ شاید چلنے سے متعلق
 ہی۔ جان نے ڈرائیور سے فریج میں کچھ کہا۔

اور ایک سرسری نظر سیٹوں پر ڈالتے ہوئے پیچھے کی طرف بڑھا۔
 وہ بیٹھ چکا۔ تو ڈرائیور نے بس چلا دی۔
 غیر ارادی طور پر ناجیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔
 کہاں بیٹھا تھا وہ؟ پیچھے چند ہی تو سیٹیں تھیں اور۔
 نظریں ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد اپنے سے بالکل ہی پچھلی سیٹ پر پڑیں۔
 جان دو افراد کی خالی سیٹ پا کر مزے سے کھلی کھڑکی سے سر ٹھکائے نیم
 دراز اس کی بھٹکتی نظروں کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔
 کچھ جھل سی ہو کر وہ دائیں اپنی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔
 ”یہ فرانس کے بہت پرانے گاؤں ہیں۔“ کھڑکی میں سر ٹھکائے نیم وا
 آنکھیں باہر جمائے وہ دھیرے سے بولا۔

ناجیہ نے دیکھا۔ وہ ایک قدیم گاؤں تھا۔ یقیناً صدیوں پرانا۔ مکانات
 پرانی طرز کے تھے۔ اور باغیچے پھولوں سے لدے۔
 ایسے کئی قدیم دیہاتوں سے گزرنے کے بعد وہ لوگ جرمنی کے بارڈر پر پہنچ
 گئے۔ کسٹمز پوسٹ پر ڈرائیور مسافروں کے پاسپورٹ دکھا کر جلد ہی واپس آ
 گیا۔

کوچ نے سرحد پار کر لی۔
 اور اب۔ وہ لوگ جرمن دیہاتوں اور قصبوں میں سے گزرنے لگے۔
 سرحد کے اس پار اچانک ہی تبدیلی آگئی تھی۔

گاؤں کے مکانات کی ساخت اور طرز بدل گئے تھے۔ گھروں کا رنگ سفید اور کھڑکیوں کے سائبان رنگین دھاری دار تھے۔ بالکنیوں کی ریلنگ سفید تھی۔ پھر۔ دکانیں تھیں، گر بے تھے اور پرانے پتھر کے مکانات تھے۔ گلیاں تنگ تھیں۔ اور چھوٹے موٹے پارک تھے جو درختوں سے گھرے ہوئے تھے۔

ایک بار پھر۔ وہ لوگ بلیک فارسٹ کے گھنے درختوں اور چمکتے چشموں کے بیچ میں سے گزر رہے تھے۔

کوچ ہلکے سے جھٹکے سے رکی تو جان کی آنکھ کھل گئی۔

”اوہ۔“ اس نے جلدی سے گھڑی دیکھی۔ ”تم نے جگایا کیوں نہیں۔“ وہ آہستہ سے اپنے آگے بیٹھی ناجیہ سے بولا۔

ناجیہ نے کنکھیوں سے اسے سوتے دیکھا تھا۔ مگر کیوں اسے جگاتی؟ بلکہ اسے تو اچھا لگا تھا۔ رات بھر وہ بے آرامی سے کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ اچھا تھا کچھ سکون پالیتا۔

”تم پاس ہو تو میں سونا نہیں چاہتا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور پھر۔ سب پنجرز چائے، کوئی، پینے نیچے اترے۔

”تم بیٹھو۔“ اسے دو کرسیوں والی میز کی طرف اشارہ کر کے وہ کاؤنٹر کی

طرف بڑھا۔ ”میں کوئی لے کر آتا ہوں۔ آنٹی کے ساتھ نہیں جانا۔ ہاں۔“

ناجیہ نے ایک نظر آگے آگے چلتی آنٹی کی طرف دیکھا۔

وہ پھر سے مسز براؤن سے جا ملی تھیں۔

ناجیہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور جان کی بتائی ہوئی میز پر جا بیٹھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ ٹرے میں کوئی اور بسکٹ لئے آ رہا تھا۔

کتنا بڑا آدمی تھا۔ کئی بحری جہازوں کے بیڑے کا مالک۔

فطرت، طبیعت، عادت تک میں ایرسٹو کر لسی رچی بسی تھی۔

چال ڈھال، انداز، شخصیت سبھی میں حوصلہ شکن فرمانروائی گھسلی ملی تھی۔
اس قدر۔ اتنی۔ کہ اکثر تواجیہ کو لگتا اس کے آس پاس کا ماحول تک
اس کی موجودگی کی وجہ سے شاہانہ ہو گیا ہے۔

اس وقت وہ عام آدمی کی طرح ٹرے ہاتھ میں لئے چلا آ رہا تھا۔ شاید اس
لئے کہ بقول اس کے۔ یہ یورپ تھا۔

”باقی کے راستے تم میرے پاس بیٹھنا، ہوں۔“ بیٹھتے ہی وہ بولا۔
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ آنٹی اور مجتبیٰ کے سامنے وہ کیونکر ایسا کر سکتی تھی۔
اور۔ جان نے ایک گہری سانس لی۔

اچھا۔ مجھے سونے مت دینا۔“ وہ کوئی کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے
بولا۔

کیسی بات کر رہا تھا؟ وہ سو جاتا تو وہ آنٹی کے سامنے اُسے آواز دے
کر جگاتی؟

وہ اس کی جھجک سمجھ گیا۔
”تم پیچھے ہاتھ کر کے مجھے ہلا کر جگا دینا۔“ کوئی کا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ
بنجیدگی سے بولا۔

اور۔ تاجیہ کو ہنسی آ گئی۔
”ایسا بھی کیا ضروری ہے۔“

”ہے۔ سو کر میں یہ لمحے کھونا نہیں چاہتا۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔
”ویسے عام طور پر مجھے یوں ہر جگہ نیند نہیں آ جاتی۔ بلکہ بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے نیند
لانے کے لئے۔ پتہ نہیں کیوں آج...“

آپ رات کو سوئے نہیں ٹھیک سے۔“ بے ساختہ تاجیہ کے منہ سے نکل گیا۔
ایک ہل کو جان چپ سا ہو گیا۔ آنکھوں کا دبدبہ گھائیل نظر آنے لگا۔ حاکمانہ
شخصیت مجروح لگنے لگی۔

پھر۔ وہ مسکرا دیا۔ گھائیل، مجروح مسکراہٹ۔

”ہاں۔“ گھائیل، مجروح نظریں کوئی سے اٹھتے بھاپ کے مرغولوں کے اُس پار جھانکنے لگیں۔ ”کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ میری نیند اڑ جاتی ہے۔ اور۔ اور۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔ میں۔ ڈھیر سارا پی جاتا ہوں۔“ وہ بہت دکھی لگ رہا تھا، بہت اُداس۔

اُس کا درد ایک بار پھر تاجیہ کے دل میں منتقل ہونے لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی اُسے کہہ دے کہ وہ ڈرکس مت کیا کرے۔ اچھی چیز نہیں ہے۔ مگر۔ وہ اس قدر دکھی تھا اس وقت۔ اتنا اُداس تھا اس سے۔ کہ اُس کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

”یہ جو جانِ عالم تمہیں نظر آتا ہے نا۔“ اُداسی سے مسکراتے ہوئے اُس نے کوئی کا گھونٹ بھرا۔ ”یہ اندر سے بہت دکھی ہے۔“

”پرویز بھائی نے بتایا تھا۔۔۔“

”پرویز نے تو زبانی بتایا ہو گا۔“ وہ اُس کی بات کانٹے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہیں یہاں۔“ اُس نے بائیں جانب اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”لے جا کر دکھاؤں گا۔ کتنے زخم ہیں یہاں۔ کتنی گہری چوٹیں ہیں ادھر۔۔۔“

اُس کے دکھ تاجیہ کو دکھی کر گئے۔ خوبصورت شریقی آنکھوں میں دھند سی چھا گئی۔

”آؤ گی تا میرے دل میں۔“ اُس کی آنکھوں میں دھند چھاتے دیکھتے ہی اُس کا لب و لہجہ بدل گیا۔

دلنشین آنکھیں گواہ بھی اُداس تھیں۔ مگر لب متبسم اور لہجہ خوشگوار ہو گیا تھا۔

اُس نے اپنا لب و لہجہ تاجیہ کی خاطر بدلا تھا۔

تاجیہ کے لب مسکرا دیئے۔

مگر۔ شریقی دھند نناک ہو گئی۔

”اوہ نو“۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”زخمِ تو اب بھرنے لگے ہیں۔ چوٹیں ٹھیک ٹھاک ہو رہی ہیں۔“

اُس کے معصوم لب و لہجے پر تاجیہ کو ہنسی آگئی۔

”دکھاؤں؟“ اُس کا ہاتھ اپنے بٹن پر گیا۔

اب اُس کا لہجہ شوخی لئے تھا۔ معنی لئے تھا۔

گھبرا کر تاجیہ نے نظریں ادھر اُدھر بیٹھے مسافروں کے ہجوم پر لگا دیں۔

اور۔۔۔ جان نے ایک زوردار قبضہ لگا لیا۔

تاجیہ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ پھر قمیض کے بٹنوں پر نظر پڑی۔

اُس نے تو کار کے پاس کا آخری بٹن بھی بند کر لیا تھا۔

کیا چیز تھا۔ تاجیہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”میں بہت بدل گیا ہوں۔“ کوئی کا آخری گھونٹ لینے ہوئے وہ کہنے لگا۔

”اب تو مجھے پاکستان کا نام بھی برا نہیں لگتا۔ بلکہ۔۔۔ بلکہ۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں تو

پاکستان کی خبریں بھی سننے لگا ہوں۔ البتہ۔۔۔ ایک دو چیزوں سے اب بھی خوف

آتا ہے۔“ اس نے خالی کپ میز پر رکھا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ایک گہری سانس

لی۔ ”آؤ چلیں۔“ ہاتھ آگے بڑھا کر اس نے تاجیہ کا ہاتھ تھام لیا۔

تاجیہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کی نظروں میں سوال تھے۔

کون سی ایک دو چیزیں تھیں جن سے اب بھی وہ خوفزدہ تھا؟

”یہ خوف بھی شاید آہستہ آہستہ جاتا رہے۔“ کوچ کی جانب بڑھتے بڑھتے

وہ تاجیہ کی سوالیہ نظروں کا جواب دینے لگا۔ ”اور نہ گیا تو۔“ وہ ساتھ ساتھ چلتی

تاجیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

”تو؟“ تاجیہ اس کا جواب سننے کو بے چین تھی۔ اسے معلوم تھا اس کے خوف

اسی کی ذات سے وابستہ تھے۔

”تو۔“ وہ جیسے سوچ میں پڑ گیا۔ ”تو۔“ میں تمہارا دوسرا نام رکھ لوں گا۔ اور ہم پاکستان میں فوجیوں کے ٹھکانوں سے کہیں دور بہت دور اپنی دنیا بسالیں گے۔“

اودہ۔ تو وہ اس کے نام سے خوفزدہ تھا۔ پاکستان آرمی سے خوفزدہ تھا! اس کے باوجود پاکستان سے لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی خاطر پاکستانی فوج سے دور پاکستان میں ہی کہیں بس جانے کی سوچ رہا تھا۔ اچانک ہی ناجیہ کا تمام تر پیار تمام تر چاہتیں۔ اس کی عظمتوں کا اعتراف کرتے ہوئے پوجا میں ڈھل گئیں۔ ”ٹھیک ہے نا۔“

اور۔ ناجیہ نے اپنا ہاتھ تھامے جان کا ہاتھ چپکے سے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

جان کا رُواں رُواں سرشار نظر آنے لگا، مدہوش نظر آنے لگا۔ پھر۔ یہی سرشاری، یہی مدہوشی اس کی آنکھوں میں بولنے لگی۔ تو۔ ناجیہ جھٹ سے ہاتھ چھڑا کر کوچ کی سیڑھی پر جا چڑھی۔ ناجیہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جان بھی آ کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ مسافر جلدی جلدی کوچ میں گھس رہے تھے۔ ناجیہ نے دیکھا آنٹی کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔

معا کوچ کے دروازے میں کیتھرین آکھڑی ہوئی۔ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

پھر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ ناجیہ سمجھ گئی اس کی نظر جان اور جان کے ساتھ والی خالی سیٹ پر پڑی تھی۔

غیر ارادی طور پر ناجیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

جان نے حسب سابق ٹانگیں سیدھی پھیلا کر سرکھڑکی میں نکاتے ہوئے

آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

”Relax.“ ہاتھ آگے بڑھا کر اس نے تاجیہ کا ہاتھ تھپتھپایا۔

جفل سی ہو کر۔ وہ سامنے دیکھنے لگی۔

کیترین تاجیہ اور جان کے سیٹوں کے پاس آ کر رک گئی۔

جان کو ساتھ والی سیٹ بھی گھیرے اور آنکھوں پر بازو رکھے دیکھ کر وہ جھنجھلا

سی گئی۔ اور پھر۔۔۔ جھنجھلائی جھنجھلائی سی تاجیہ کے ساتھ خالی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

آنکھوں سے بازو ہٹا کر جان نے ایک نظر کھڑکی میں سے جھانکتی تاجیہ کو دیکھا۔

وہ کچھ خفا خفا سی تھی، غصہ غصہ سی تھی۔

جان مسکرا دیا۔ آنکھیں پھر سے بازو سے ڈھک لیں۔

بس چل پڑی تھی۔ مگر تاجیہ اب بھی خفا خفا سی، غصہ غصہ سی باہر خلاؤں میں گھور

رہی تھی۔

جان کنکھیوں سے اسے دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔

”پانی منگو او؟“ جان آنکھیں ڈھکے ڈھکے ہی دھیرے سے بولا۔

”تو جان بوجھ کر سوتے بنے تھے آپ۔“ اچانک کیترین پیچھے مڑتے

ہوئے فریج میں بولی۔

اور۔۔۔ جان کی پوزیشن عجیب سی ہو گئی۔

بازو کے نیچے سے تاجیہ کو دیکھا۔

اس کا جیسے سارا خون کسی نے نچوڑ لیا تھا۔

”لیکن اب میں جیج سونا چاہتا ہوں۔“ اس نے آنکھوں سے بازو ہٹائے

بغیر ہی کہا۔

کیترین برا سا مان کر سامنے دیکھنے لگی۔

اور جان نے دیکھا۔ تاجیہ کی جان میں جان آ گئی تھی۔

وہ لوگ فری برگ، جرمی میں اترے۔ ایک پرانے یونیورسٹی ٹاؤن میں۔

ادھر ادھر گھومے پھرے چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ چھوٹی چھوٹی پلیٹیں، ایش ٹرے، کپ، سکارف، بروج، جیولری، جن پر اسی علاقے کے خاص خاص مقامات بنے یا کندہ تھے۔ اور جو خاص طور سے سیاحوں کے لئے دکانوں اور سٹالوں پر سجائے گئے تھے۔

جرمنی میں ہی لُنج کرنے کے بعد وہ لوگ آگے بڑھے۔
سوئزر لینڈ کی سرحد پار کی۔

اور اب — وہ لوگ سوئیس دیہاتوں میں سے گزر رہے تھے۔ اونچے الپس برف سے ڈھکے تھے۔ قریبی پہاڑوں کے ڈھلانوں پر سدا بہار جنگلات تھے۔ بہت اوپر کھڑی ڈھلانوں پر بکریاں چر رہی تھیں۔ نیچے وادی میں جس گاؤں میں سے وہ لوگ گزر رہے تھے گھروں کی چھتیں ڈھلانی تھیں۔ اور — سامنے بہتے گنگلتا تے جھرنے تھے۔

اسے کاغان یاد آ گیا۔ کالام یاد آ گیا۔

پھر Basle آ پہنچا۔

کوچ سے اتر کر ایک طرف ہوتے ہوئے وہ آنٹی کے اترنے کا انتظار کرنے لگی۔

”آؤ نا۔“ جان نے کہا۔

”اس دفعہ آنٹی کے ساتھ۔“

”پھر میں بھی اس دفعہ ...“ وہ مڑا۔

ناجیہ کا رنگ پھر سفید پڑ گیا۔ وہ یقیناً چند قدم پر کھڑی کیتھرین کی طرف چلا تھا۔

اس نے مڑ کر ہی نہیں دیکھا — نہیں دیکھ سکتی تھی وہ اسے کیتھرین کے ساتھ۔
آنٹی بس میں سے برآمد ہوئیں — تو ناجیہ ان کے ساتھ مسافروں کے ہجوم کی طرف بڑھی۔ کبھی قریبی شوپنگ سنٹر کی طرف جا رہے تھے۔

آنٹی اور تاجیہ بھی ایک دکان کے آگے رک گئیں۔ شوونڈوز میں خوبصورت چیزیں بھی تھیں۔ وہی سیر کرنے والوں کو کھینچ لانے والی چھوٹی موٹی یادگار چیزیں۔ سب پر بیزل کی مشہور جگہیں چھپی یا کندہ تھیں۔ وہ سٹریٹ میں آگے بڑھتی گئیں۔

ایک دکان میں مشہور سوئیس لیس کی بنی ہوئی چیزیں تھیں۔ ”یہاں کی لیس مشہور ہے۔ یہ گاؤں کی عورتیں اپنے ہاتھوں سے بناتی ہیں۔“ پاس ہی سے جان کی آواز آئی۔

تاجیہ نے مڑ کر دیکھا۔ مسز براؤن کو ساتھ ساتھ لئے وہ ان کے پیچھے اسی دکان میں کھڑا نہیں بتا رہا تھا۔

اس کے ساتھ کیتھرین کی بجائے مسز براؤن کو دیکھ کر تاجیہ کے خوبصورت چہرے پر اطمینان کی جھلک صاف نظر آنے لگی۔

لیس کی دو ایک چیزیں خرید کر آنٹی اور تاجیہ دکان سے نکل کر سڑک کے اس پار والی کینے میں چلی گئیں۔ آنٹی کو کوئی کی طلب جو بہت دیر سے ہو رہی تھی۔

تاجیہ نے دیکھا جان بھی مسز براؤن کو اپنے بازو کا سہارا دیئے کینے میں لے آیا۔

آنٹی کی نظر پڑی تو دونوں کو پاس بلا لیا۔

پھر چاروں اکٹھے ہی ایک میز پر بیٹھ گئے۔

جان نے آنٹی اور مسز براؤن کے لئے کوئی اور تاجیہ اور اپنے لئے آکس کریم منگوائی۔

”یہاں لوگ گائے کم اور بکریاں زیادہ پالتے ہیں۔ بکری کے دودھ سے بہت عمدہ پنیر بنائی جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ مکھن کی نسبت پنیر زیادہ کھاتے ہیں۔“ جان مسز براؤن اور آنٹی کو سوئٹزر لینڈ کے متعلق بتا رہا تھا۔ ”یہاں بہت خوبصورت آبشار ہیں، جھیلیں اور زبردست گلیشئرز ہیں۔ سوئٹزر لینڈ

کی تو آدھے سے زیادہ انکم سیاحت سے ہے۔ اسی کے فروغ پر زیادہ تر رقم خرچ کی جاتی ہے۔۔۔“

پھر کوئی اور آئس کریم آگئی۔ بڑے بڑے گلاسوں میں چیری اور اناس پر آئس کریم کی تھیں جی تھیں۔ اوپر کریم اور سب سے اوپر پے ہوئے اخروٹ تھے۔

”کھاؤ۔“ وہ اپنے دائیں بیٹھی ناجیہ سے دھیرے سے مخاطب ہوا۔
 ”سوئیس سوئٹلی ہے فرج نہیں۔“ سب کی نظریں بچا کر اس نے اسے ایک شریر سی ویک دی۔

گھبرا کر ناجیہ نے آنٹی اور مسز براؤن کی طرف دیکھا۔
 دونوں باتوں کے ساتھ ساتھ کوئی پینے میں مصروف تھیں۔
 لانی لانی سیاہ پلکیں جھکائے وہ آئس کریم کھانے لگی۔
 جان اپنائیت سے اسے دیکھ دیکھ کر اپنی آئس کریم کھا رہا۔
 کیفے سے نکل کر۔ وہ لوگ پھر سے بس میں آ بیٹھے۔
 پنچر ز آہستہ آہستہ آ کر اپنی سیٹوں پر بیٹھ رہے تھے۔
 اب کے آنٹی کے ساتھ مسز براؤن بیٹھ گئیں۔ مجبورا ان کے پیچھے والی سیٹ پر ناجیہ کو بیٹھنا پڑا۔

جان نے اس کے پاس بیٹھنے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں پیشکش کی تھی۔ مگر اگلی ہی سیٹ پر آنٹی کی وجہ سے ناجیہ کی پوزیشن سمجھتے ہوئے وہ ناجیہ کے پیچھے دو خالی سیٹوں پر پھر سے نیم دراز ہو گیا۔

اس کا پورے دو سیٹوں پر قبضہ جمالینے کی وجہ ناجیہ جانتی تھی۔
 وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور اس کے پاس آ کر بیٹھے۔

اور۔۔۔ اس کی خلوتوں میں اس کی سوچوں میں شریک ہو۔ ایک ہی سیٹ پر نہ سہی وہ اس کے قریب تو تھا۔ زیادہ بات چیت نہ سہی، کبھی کبھار ایک آدھ بات تو

کر لیتا تھا۔ سارا وقت بغیر کسی اندیشے کے اسے تکتا تو رہتا تھا۔ کسی اور کی موجودگی میں یہ سب کیسے ممکن تھا؟

”کیا سب لوگ موجود ہیں؟“ مسافروں کی کنتی کرتے ہوئے کوریئر بولی۔

اور پھر اپنی تسلی کر لینے کے بعد چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ جان کے پاس آئی۔ ڈیج زبان میں کچھ بولتی رہی۔ جان نے بھی جیسے کچھ ہدایات دیں۔ اور کوریئر آگے جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھی۔ تو ڈرائیور سے بس چلا دی۔

”ہم لوگ بارڈر پر سے گزر کر برمنی جائیں گے۔ اس کے بعد سرحد پار کر کے دوبارہ فرانس میں داخل ہوں گے۔ ڈنر ہم لوگ فرانس کے ایک عمدہ ریستورنٹ میں کھائیں گے۔ آپ لوگوں کو فہمیت خوشگوار ماحول میں بہت لذیذ اور عمدہ شراب سے نوازا جائے گا۔“

کوریئر نے مسکراتے ہوئے انہیں بتایا۔

کوچ تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ناجیہ نے کڑکی میں سے دیکھا۔ سورج مغرب کی طرف رواں دواں تھا۔ قریبی ڈھلان ایک بار پھر انگور کی بیلوں سے آٹے پڑے تھے۔ ہوا خنک اور موسم خوشگوار تھا۔

”یہ علاقہ جس میں سے ہم گزر رہے ہیں۔“ حسب سابق کروٹ کے بل لینے کوچ کی کھلی کڑکی سے سرنگائے نیم وا آنکھیں تاحہ نظر ڈھلانوں پر پھیلے انگوروں پر جمائے جان آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”بلکہ یہ راستہ جس پر سے ہم لوگ گزر رہے ہیں۔‘Route du vin‘ کہلاتا ہے۔ انہی شراب بننے والے انگوروں کے باغات کی وجہ سے۔ سن رہی ہوتا۔“ ہاتھ بڑھا کر ناجیہ کا سیٹ کے بازو پر رکھے ہاتھ پر اس نے اپنائیت سے اپنا ہاتھ رکھا۔

ناجیہ آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال کر رخ اس کی طرف کرتے ہوئے مسکرا دی۔

”سن رہی ہوں۔“

”اور۔“ اس نے دوبارہ ہاتھ اس کے ہاتھ پر دھر دیا۔ ”وہ جو دور پہاڑ نظر آرہے ہیں نا۔“ اس نے اپنے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”وہ ‘Vosges Mountains’ ہیں اور اس طرف والے۔“ اس نے دور اپنے دوسری طرف اشارہ کیا۔ ”جرمنی کے ‘Black Mountains’ ہیں۔“

”اچھا۔“ تاجیہ نے پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔ اور۔ جان نے ہاتھ مزید آگے بڑھا کر۔ اس کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اور پرندوں کے غول کے غول سرسراتے ہوئے اپنے آشیانوں کی جانب چل دیئے تھے۔

کوچ ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ہوٹل کے آگے رکی۔ جان اٹھ بیٹھا۔ کپڑوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بے ترتیب بالوں میں اگلیاں پھنسا کر درست کرنے کی کوشش کی۔ باقی مسافروں کے ساتھ ساتھ آئی، مسز براؤن، تاجیہ اور جان بھی ہوٹل کی طرف بڑھے۔

باہر کی طرح ہوٹل اندر سے بھی بہت خوبصورت تھا۔ گہرے مرون گداز قالین بچھے تھے۔ قیمتی لمبی میزیں قطاروں میں لگی تھیں۔ ہر میز کے گرد گدے دار خوبصورت کرسیاں تھیں۔ میزوں کے وسط میں خوبصورت گلدان موسم کے حسین اور معطر پھولوں سے آراستہ تھے۔ جگہ جگہ کانسی کے خوبصورت مجسموں کی شکل کے کینڈل سٹکوں میں بڑی بڑی سفید موم بتیاں لگی تھیں۔ کھڑکیوں کے پاس گلوں میں ہرے بھرے پودے لگے تھے۔ اور ہر میز کے پاس کانسی کے اونچے اونچے قیمتی شید والے لیپ ایستادہ تھے۔

لوگ متعدد ویٹرز اور ویٹریسوں کی رہنمائی میں تیزی سے میزوں کے گرد بیٹھنے لگے۔

تجبی۔ ایک معزز سا آدمی پنجرز کے ہجوم میں سے راستہ بناتا جان کی طرف آیا۔

گر مجبوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔ اسے گریٹ کیا۔

اور ہنس ہنس کر بات کرنے لگا۔ وہ دونوں آپس میں فریج میں بات کر رہے تھے۔ ناجیہ سمجھ نہ سکی مگر اتنا ضرور جان گئی۔ کہ آدمی جان کو پہلے سے جانتا تھا۔

چھ چھ افراد ایک ایک میز کے گرد بیٹھ رہے تھے۔ آنٹی مسز براؤن کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ایک میز کی طرف بڑھیں جہاں چار لوگ پہلے سے بیٹھ چکے تھے۔

”تم مسٹر عالم کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔“ آنٹی جاتے جاتے قریب کھڑے جان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔ ”ہم بڑھے بڑھے بیٹھ جائیں گے۔“

انکی مسکراہٹ میں شفقت کے ساتھ ساتھ جیسے تاکید سی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہوں تمہیں مسٹر عالم کے ساتھ بیٹھنا چاہئے۔

ادہ۔ تو آنٹی سب سمجھ رہی تھیں۔ جمبی اکثر و بیشتر جان کو اس کے آس پاس دیکھتے ہی مسز براؤن کی طرف بڑھ جاتی تھیں۔

تو۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ جان کے قریب رہے۔ اسے ایک گونہ اطمینان سا ہوا۔ کم از کم اسے اپنی ایک بزرگ کی حمایت تو حاصل ہو گئی تھی۔

”آؤ۔“ جان کے جیسے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے۔ اتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب لے آیا۔ ”یہ۔“ وہ رک سا گیا، اس کی آنکھوں میں دیکھا، سرخ سنہری

چمکیلے رنگ آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے، اسے اس کا نام مل گیا۔ ”ہیزل ہے۔“ اس نے فریج پنجر سے ناجیہ کا نئے نام سے تعارف کروایا۔ ”اور یہ مسٹر فلپ۔“

اس ہوٹل کے پنجر۔“ اس نے ناجیہ سے کہا۔

پنجر نے تفسیلاً قدرے جھکتے ہوئے ناجیہ کو خوش آمدید کہا۔

پھر— دونوں کو اپنی ہمراہی میں لئے — ایک تنہا گوشے میں لگی میز پر لے آیا۔

بٹتے ہوئے ہی فیجر نے ایک دو جیلے اور کہے اور پھر — واپس چل دیا۔
 ”اتنا ہنس ہنس کر کیا کہہ رہے تھے آپ دونوں۔“ ناجیہ نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”اوہ۔“ وہ چپ ہو گیا۔

”بتائیں نا۔“

اصل میں اسے پہلے سے اطلاع تھی کہ شپ کے پنجرز کے ساتھ میں بھی آ رہا ہوں اور — ”وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔“ اور — ”میرے ساتھ تم بھی ہو۔“
 تو جیسی الگ میز لگائی گئی تھی — وہ بھی ایک تنہا کونے میں۔
 اس کی پلکیں مرنے اٹھنے لگیں۔
 ”پھر؟“ وہ بمشکل بولی۔

”پھر کیا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس لئے ہنس رہا تھا۔“

”اس سے پہلے اس نے آپ کے ساتھ کبھی لڑکی نہیں دیکھی؟“ جبکہ خود ناجیہ نے ان چند دنوں میں ہی اسے کئی لڑکیوں کے ساتھ کپ شپ کرتے دیکھا تھا۔
 ”اوں — نہیں۔ اس سے پہلے میں اتنی مشکوک حالت میں بھی نہیں پایا گیا۔ اور — نہ ہی اسے اس سے پہلے میرے متعلق اتنی پر اسرار اطلاع ملی ہے۔“ وہ ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔
 وہ بھی ہنس دی۔

”ویسے دونوں بار آپ نے ’اتنی‘ پر کافی زور دیا ہے۔“

جان نے ایک خوشگوار تہقہ لگا لیا۔

”ہاں — کیونکہ ہونے کو تو میرے ساتھ اس وقت مہ پارہ بھی ہو سکتی تھی۔
 کیتھرین بھی ہو سکتی تھی — مگر — ان سے متعلق یہاں اس فیجر کو اطلاع کبھی نہ

دی جاتی...“
 اور— بات ختم کرتے کرتے جان نے دیکھا۔ تاجیہ کی خوبصورت
 آنکھوں میں کرب کی پرچھائیاں چھانے لگی تھیں۔
 ”اچھا چھوڑو— سنو۔“ وہ بات کا موضوع بدلے ہوئے کہنے لگا۔ ”پتہ

ہے اور کیا کہہ رہا تھا؟“

تاجیہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”کہتا تھا کہ اسے امید ہے اگلی بار وہ ہم دونوں کہاں بیوی کی شکل میں
 دیکھے گا۔“ اس نے فیجر کی بات دہرائی۔
 تاجیہ کی پلکیں جھک گئیں۔ چہرہ کانوں کی لوؤں تک رخ ہو گیا۔
 ”اور بھی سنو نا۔“ وہ بے طرح محظوظ ہوا۔

”نہیں۔“ جھکی پلکیں لئے اس نے سر فنی میں ہلادیا۔
 ”کہتا تھا— اسے یہ بھی امید ہے کہ اس سے لگا بارہ ہم دونوں کو دو عدد
 بچوں کے ساتھ دیکھے گا۔“ اب کے وہ خالص جھوٹ ہوا۔
 اور— احتجاجاً تاجیہ کا ہاتھ میز پر رکھے کانسی کے بڈل سنک کی طرف بڑھا۔
 ”نہیں کہا تھا، یہ نہیں کہا تھا۔ شادی کے بعد ہمارے بچے ہونا لازمی ہیں یہ وہ
 سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے تو یہاں فیجر ہے۔ اور ہمارا خاصا پڑھا لکھا ہے کسی
 سرکاری عہدے پر ہوتا آج۔“

اور— لا جواب سی تاجیہ سامنے سے آئی اور دیکھنے لگی۔

ویٹریس پہلا کورس سوپ کالائی۔

جان نے اس سے دائیں لست منگوائی۔

تاجیہ پھر خاموش خاموش نظر آنے لگی۔ اسے ہلکا سا پینا کبھی اچھا نہیں
 لگا تھا۔ جب وہ پریشان ہوتا تھا تو وہ پی لیتا تو پی لے کر اسے افسوس ہوتا تھا۔
 مگر— اس وقت— اس وقت تو وہ پریشان نہ تھا پھر کیوں لست منگوائی۔

تھی۔

”کیا بات ہے؟“ جان اسے چپ چپ سا دیکھ کر چونکا۔

”آپ وائمن نہیں پیئیں گے۔“

”اڑہ۔ مگر۔“

اگر مگر کچھ نہیں۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ پریشان ہوتے ہیں تو پیتے ہیں۔

اور۔ اس وقت آپ پریشان نہیں ہیں۔“

”آں۔ ہاں۔ میں تو بہت خوش ہوں اس وقت۔“

”تو پھر؟“

”بس۔ یہاں کی وائمن بہت لذیذ ہوتی ہے۔ بلکہ۔ یہ۔ تو ہے ہی

وائمن ریسٹورنٹ...“ جیسے اس سے بات ہی نہ بن پارہی تھی۔

”کچھ بھی ہو آپ نہیں پیئیں گے۔“

جان چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔

”او کے میم۔ نہیں پیئیں گے خوش۔“ جان کو اچھا لگا۔ کوئی اسے ٹوکنے والا بھی

پیدا ہو گیا تھا۔

ویٹر بس لسٹ لے آئی۔ اور جان نے معذرت کے ساتھ لوٹا دی۔

تاجیہ کی خوش اس کی دیکتی آنکھوں سے عیاں تھی۔

سوپ کے بعد کئی کھانے آئے۔ سلاڈ تھے اور آخر میں سویٹ ڈش۔

”آپ۔ آپ۔ آسندہ بھی نہیں پیئیں گے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

بچپن سے لے کر اب تک یورپ میں ان لوگوں سے گھل مل کر رہتے ہوئے

اسے بھی اس چیز سے کوئی خاص مار محسوس نہ ہوتی تھی۔

کبھی کبھی وہ ضرور پی لیتا تھا۔ ہاں بابا جان کے سامنے اس نے کبھی نہیں پی

تھی۔

مطلب یہ کہ آپ ڈیپریس ہوں گے تب بھی نہیں پیئیں گے۔
 ”بڑی مشکل ہوگئی۔“ اس نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔
 ”نہیں پیئیں گے نا۔“

”سوچنے کو تھوڑا وقت چاہیئے۔“
 ”نہیں۔ وعدہ کریں آپ آئندہ نہیں پیئیں گے۔“
 ”میں۔ وعدہ کیسے کر لوں۔ میں ڈیپریس ہوتا ہوں تو۔۔۔ تو...“
 ”آپ کوشش کریں آپ ڈیپریس نہ ہوں۔“
 چند لمبے وہ جیسے کسی سوچ میں پڑ گیا۔
 ”اچھا تم ایک وعدہ کرو۔“
 ”کیا۔“

”تم کوشش کرو گی کہ میں ڈیپریس نہ ہونے پاؤں۔“
 تھوڑی دیر کو ناجیہ چپ سی ہوگئی۔

اس کا اشارہ صاف تھا۔ ناجیہ کا پوری وفاداری کے ساتھ تادم آخر اس کا
 ساتھ دینا۔

پوری وفاداری کے ساتھ تادم آخر اس کا ساتھ دینا تو ناجیہ کا ایمان تھا۔
 مگر۔ کیا وہ اتنی آسانی سے اس کی بن سکے گی جتنا ان دونوں نے
 سوچا تھا؟ کیا جان کے بابا جان مان جائیں گے؟ کیا خود اس کے ابو امی راضی ہو
 جائیں گے؟ ان سب ک علاوہ کیا کوئی اور رکاوٹ پیش نہیں آ سکے گی؟ کل کی خبر
 کس کو ہوتی ہے!

چند ثانیوں کو اسے اندیشوں نے آن گھیرا۔

جان چونک سا گیا۔ پرکشش چہرے پر سائے سے لرزاٹھے

”بولو نا۔“ اس نے میز پر رکھے ناجیہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

ناجیہ ہوش کی دنیا میں آگئی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دیکھا۔ اس کا لس

محسوس کیا۔ تو اسے احساس ہوا۔

وہ تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب تھا۔ اس کی زندگی تھا، اس کی جان

تھا۔

اس نے جھٹکتے ہوئے دھیرے سے اپنے ہونٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

وہ ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ہر رکاوٹ سے لڑے گی۔

اس کی زندگی اور موت دونوں اسی کے لئے تھے۔

دو موتی لڑھک کر جان کے ہاتھ پر آ گرے۔

جان کے چہرے پر کے سائے معدوم ہو گئے۔ ذہنی کھچاؤ چھٹ گیا۔

دلنشین آنکھیں چمک اٹھیں۔ پرکشش لب مسکرا دیئے۔

اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس کی نم شرتی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے دونوں

موتی اپنے ہونٹوں میں جذب کر لئے۔

”اب نہیں پیوؤں گا وعدہ، ہوں۔“

اور تاجیہ بھیگی ہلکیس لئے مسکرا دی۔

وہ لوگ پھر کوچ میں بیٹھ گئے۔ اُسی سابقہ انداز میں، انہی سیٹوں پر اُسی

ترتیب کے ساتھ۔

باہر گھپ اندھیرا تھا۔ سفر لمبا تھا۔ شپ پر پہنچنے کے لئے کئی گھنٹے درکار تھے۔

جان نے اپنے مخصوص انداز میں نیم دراز ہو کر سر کھڑکی سے نکال لیا۔ تاجیہ بھی

سریٹ کی پشت سے لگائے باہر گھور رہی تھی۔

باہر۔ اندھیرا تھا ہر سو۔

مگر۔ آنکھیں ایک بارتاریکی سے مانوس ہوئیں۔ تو پھر سے جیسے سب کچھ نظر

آنے لگا۔ دھندلا دھندلا سا، مدھم مدھم سا۔

پہاڑی ڈھلانیں اب بھی انگوڑ کی بیلوں سے ڈھکی نظر آرہی تھیں۔ دُور پار

کے پہاڑ اب بھی نما ہاں تھے۔

گاڑی رفتار پکڑ رہی تھی اور خنکی بڑھ گئی تھی۔

سرد ہوا کا ریلہ آیا۔ ناجیہ کو جھر جھری سی آگئی۔

”یہ لو“۔ جان جیسے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اپنی جیکٹ اُتار کر پیچھے سے اُس کے کندھوں پر ڈال لی۔

”آپ؟“ اُسے معلوم تھا جان کے پاس بس یہی جیکٹ تھی۔ ”مجھے کچھ نہیں ہوتا۔“

اور۔۔۔ جان کی جیکٹ کے تحفظ کے احساس نے جیسے تھک تھک کر اُسے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

آنکھ کھلی۔ تو دیکھا سڑاس برگ میں لٹکر انداز شپ اُن کا منتظر تھا۔ جیسے گھر ہوا ہنا۔ اُسے تو ان چند دنوں میں ہی اس شپ سے اُنس سا ہو گیا تھا۔

”آپ کے لئے پیغام ہے۔“ ناجیہ کے ساتھ ساتھ گینگ دے چڑھتے جان کو چھوٹے ہی میجر نے آیا۔

اور رپشن تک پہنچتے پہنچتے میجر باقی بات چیت بھی ذبح میں کر رہا۔ پھر وہ آفس چلا گیا۔ اور جان ناجیہ کے ساتھ لاؤنج میں سے ہوتا نیچے کینوں کی طرف بڑھا۔

”تم نے میرا سارا پروگرام خراب کر دیا۔“ جان اچانک سنجیدگی سے بولا۔
”کیا مطلب؟“

”آج میرا خیال تھا ٹرپ سے واپس آ کر بابا جان سے لموں گا، بات کروں گا، کل پیغام بھی چھوڑا تھا۔“ اُس کا اشارہ ناجیہ سے متعلق اپنے بابا جان سے بات کرنے کا تھا۔

”تو؟“

”وہ ضروری کام سے لندن چلے گئے۔ میجر کہتا تھا۔“

”پھر؟“

”پھر کیا — کل کی فلا میٹ سے مجھے بھی لنڈن جانا پڑے گا۔“
 اور — ناجیہ کا جیسے دم آنکھوں میں آ گیا۔ کھڑے قد سے جیسے لڑکھڑانے لگی۔
 اوہ — وہ تو مذاق کی بھی متحمل نہ تھی۔ جان ساری شرارت بھول بھال گیا۔
 ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ اس نے جلدی سے اسے اپنے بازو کا سہارا دیا
 ”میں ایمرٹڈیم تک تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ سارا ایمرٹڈیم گھومیں گے۔ اس
 کے بعد بائے ایئر لنڈن جاؤں گا۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں کہتا رہا۔
 اور — ناجیہ بخل سی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔

”ویسے — تمہیں عادت ڈالنی پڑے گی۔ میں تو بہت مصروف آدمی ہوں۔ آگے
 کیا کرو گی؟“ اس کی آنکھوں میں شوخی تھی، ہونٹوں پر شریر مسکان۔
 رخ پھیر کر ناجیہ نے اسے دیکھا۔

”اچھا بابا، اچھا — ساتھ ساتھ لئے پھروں گا اب خوش۔“
 وہ مسکرا دی، وہ خوبصورت باتیں کرتا جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا۔
 اسے کیبن تک پہنچا کر — تھکا تھکا سا جان اپنے کیبن میں جا گھسا۔

علی الصبح پانچ بجتے ہی شپ کے انجن سٹارٹ ہوئے۔
مسافروں کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔

آج وہ لوگ واپس جا رہے تھے۔
تاجیہ بھی جاگ گئی۔ پتہ نہیں کیوں جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کا دل جیسے
کوئی مٹھی میں پہنچ رہا تھا۔ اٹھ کر اس نے وضو کیا۔ نماز پڑھی اور اوپر ڈیک پر
آگئی۔

خنک اور پاکیزہ ماحول تھا۔ دور دور تک پانی تھا۔
اور۔ بہت دور۔ پانی اور آکاش کا سنگم۔ جیسے اس سے آگے کچھ بھی
نہیں تھا۔

حسب معمول صبح ہی صبح دریائی ٹریفک چل پڑی تھی۔
 ناشتے کی بیل ہوئی تو نیچے آ کر وہ آنٹی کو ان کے کیبن سے لے کر اوپر لاؤنج
 میں آگئی۔

آج آنٹی اپنی اور تاجیہ اپنی میز پر اکیلی ہی تھیں۔ باقی کے لوگ ابھی نہیں
 آئے تھے۔

دونوں پاس پاس بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں۔ اور جب سست رفتاری سے چلتا
 مجتبیٰ آتا دکھائی دیا تو تاجیہ آنٹی کے ساتھ اوپر دوبارہ ڈیک پر جا رہی تھی۔
 اب کے جہاز کا رخ اترائی کی طرف تھا۔ جہاز کی رفتار اس رخ پر پہلے کئی
 دنوں کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔

ہر چیز تیزی سے پاس سے گزر رہی تھی۔ پکنک مناتی پارٹیاں، گاؤں، لوگ۔
 لچ کے بعد وہ لوگ میز پہنچ گئے۔

عملہ جہاز کے لنکر باندھنے میں مصروف تھا۔ اور کئی مسافر حسب معمول اس
 وقت بھی دلچسپی سے عملے کو جہاز کی رسیاں، زنجیریں باندھتے دیکھ رہے تھے۔
 موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر جگہ جگہ سفید بادل تیرتے نظر آ رہے تھے۔ ہوا
 معتدل تھی اور۔ آکاش کی نیلگوں و سعتوں میں اکا دکا پرندے ڈول ڈول
 رہے تھے۔

مجتبیٰ حسب سابق مہ پارہ کے ساتھ اور تاجیہ آنٹی کیساتھ ساحل کی طرف چل
 پڑے۔ جاتے وقت وہ میز میں نہیں گھوم سکی تھی۔ ہائیڈل برگ چلی گئی تھی۔
 باقی پنجرز کے ہمراہ وہ دونوں بھی گلیوں اور بازاروں میں گھومتی
 رہیں۔ انہوں نے سڑکوں پر چلتے ٹرام دیکھے۔ قدیم عمارتوں کی خستہ حال سیڑھیوں
 پر سے گزریں۔ عظیم کھید رل دیکھا جس کا ذکر سفر پر جاتی دفعہ کوریئر نے کیا تھا اور
 جو ایک ہزار سال پرانا تھا۔ سٹن برگ میوزیم دیکھا۔

آنٹی اور تاجیہ نے بھی باقی لوگوں کے ہمراہ پوینٹ کیفے میں کھایا پیا۔ مختلف

گلیوں میں گھومنے پھرنے کے بعد وہ دونوں مسٹر اور مسز مارشن کے ساتھ ملکر ٹیکسی میں شپ پر آ گئیں۔

آنٹی تھکن کا کہہ کر اپنے کیمن میں چلی گئیں۔ اور تاجیہ لاؤنج میں لائبریری کے قریب ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی۔

جان آج اسے صرف کوریڈور میں سے گزرتے ایک بار ملا تھا اور بس۔
آج وہ صبح سے مختلف کاموں میں مصروف تھا۔ کبھی کپٹنز برج پر نظر آتا تو کبھی ریسپشن ڈیسک میں مصروف ہوتا۔

وہ بے دلی سے کتاب کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ پھر کتاب اٹھا کر میز پر جیسے بٹخ دی۔

”کتاب بچاری پر کیوں غصہ اتار رہی ہو؟“ جان تھا، مقابل کی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔

وہ ہنس دی۔

ویٹریس دونوں کے لئے جان کے دیئے گئے آرڈر کے مطابق آئس کریم او ربکٹ لے آئی۔

”لو“۔ جان نے آئس کریم اس کے قریب سرکائی۔

اس نے خاموشی سے آئس کریم اٹھالی۔

وہ چپ چپ تھی، جان سمجھ رہا تھا کیوں؟

”اب بات بھی کرو“۔

اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بس۔

وہ مسکرا دیا۔

”کیا کروں — کام ہوتا ہے بہت۔“

”آپ شپ پر نہ ہوتے تو بھی کوئی کر رہی لیتا کام۔“

”ہاں۔ یہ تم نے ٹھیک کہا۔“

”پھر کرنے دیں نا۔“

وہ اس کی بچوں کی سی ضد پر ہنس دیا۔

”ہنتے کیوں ہیں۔“

”رویا تو تم بھی رو دو گی۔“

اس سے جیتنا مشکل تھا، ناجیہ بخوبی جانتی تھی۔

ساری شام پھر جان مصروف رہا۔

رات ڈنر جان اور ناجیہ نے مسٹر اور مسز مارٹن کے ساتھ مل کر کیا۔ قریبی میز

پر آنٹی بھی تھیں۔

تبھی مجتبیٰ اور مہ پارہ ہال میں نمودار ہوئے۔ مہ پارہ سرشار لگ رہی تھی مجتبیٰ بس بھارہا تھا جیسے۔

رات سوچوں میں ڈوبی وہ بستر پر لیٹی تھی۔

تین دن اور تھے اور بس۔ آگے کیا ہوگا؟ کیا کرے گی وہ؟ جدائی کا خوف

جیسے اسے نلگے جا رہا تھا۔

معاپاس والے کیبن میں سے تیز تیز باتوں کی آواز آئی۔

یہ تو۔۔۔ مہ پارہ تھی شاید۔ کچھ سرگوشیاں، کچھ سکیاں وہ بے کل ہو گئی۔

پھر دروازہ کھلا اور بند ہوا تھا۔ چلی گئی تھی شاید۔ کیبن میں سکون ہو گیا

تھا۔

مگر۔۔۔ اس کا سکون لٹ چکا تھا۔

آج وہ جلدی ناشتے پر آگئی تھی۔ علی الصبح آنکھ کھلتے ہی اس کی نظروں میں
 مہ پارہ اور جان گھومنے لگے تھے۔ بے چین سی ہو کر وہ بستر سے اٹھ آئی تھی۔
 پھر— آنٹی کی طرف بھی نہیں گئی۔ سیدھی ادھر ناشتے کی میز پر آگئی۔
 ”ہیلو میم۔“ جان تھا، ہشاش بشاش۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔
 ”ہیلو“۔ وہ سر جھکائے دھیرے سے بولی۔

اور— جان فوراً سمجھ گیا۔ رات وہ مہ پارہ کی اس کے کیمبن میں آمد جان گئی
 تھی۔ پاس پاس کیمبن تھے، پتلے پتلے پارٹیشن۔ ذرا سا کھٹکا بھی ہوتا تو ساتھ والے
 کو پتہ چل جاتا تھا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولا۔

اس نے چپکے سے پلکیں اٹھائیں۔ اور بس۔
 ”باپ رے۔“ اس نے کپٹی سہلائی۔ تم تو پھر خفا ہو۔
 اور۔ اس کی مصنوعی بپارگی پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ہنسی آ گئی۔
 ویرلیس ناچیہ کے بعد جان کا ناشتہ لا کر لگا گئی۔
 ”شروع کرو نا۔“ جان نے اسکے ہنوز اسی طرح رکھے ناشتے کی طرف
 اشارہ کیا۔

ناچیہ خاموشی سے ناشتے میں مصروف ہو گئی۔
 ”رات مہ پارہ آئی تھی۔“ اس کی چپ سمجھتے ہوئے جان نے بتا دینا
 ضروری سمجھا۔

”کیوں آئی تھی؟“
 ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“
 ”کیا کہہ رہی تھی؟“
 ”یہی کہ۔۔۔ وہ مجھے۔۔۔ اب بھی چاہتی ہے۔“
 ”اور جتنی بھائی کے ساتھ؟“
 ”مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے میں نے نہیں پوچھا۔“
 ”پھر؟“

”چلی گئی۔“
 ”روتی ہوئی۔“

”ہاں۔“
 ”لیکن۔“
 ”لیکن کیا؟“

”ایک وقت میں دو... دو...“

”یہی تو وہ بات ہے جو تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔“ وہ خوشنوازی سے بولا۔ ”ویسے

یہ اب فیشن بن چکا ہے۔“

ناشتے کے بعد وہ دونوں اوپڑیک پر آ گئے۔

اب ایک بار پھر وہ لوگ Lorelei Rock کے پاس سے گزر رہے تھے۔

”یہاں عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہیں۔“ جان کو اس سائرن کی کہانی کا

خیال آ گیا۔ جو اس چٹان سے متعلق اس علاقے میں مشہور تھی۔

”ہاں۔۔۔ جاتے وقت کوریئر نے سنائی تھی۔“ وہ کچے انگوروں سے لدی

انگور کی بیلوں پر نظریں جمائے بولی۔

تبھی۔۔۔ شپ کیپٹن قریب چلا آیا۔

اس نے جان سے ڈچ زبان میں کچھ کہا۔

جان اٹھ کھڑا ہوا۔

میں ذرا اس کے ساتھ جاتا ہوں، کچھ کام ہے۔ ہاں۔“

اس نے اپنائیت سے ناجیہ سے کہا۔

وہ مڑ کر دونوں کو کیپٹن زبرج جاتے دیکھتی رہی۔

Cologne آپہنچا تھا۔ شپ ایک بار پھر رُک گیا تھا۔

گینگ وے لینڈنگ سٹیج کے ساتھ لگ چکی تھی۔ لوگ اندر باہر آنے جانے

لگے تھے۔

جامنی پھولدار کپڑوں کے ساتھ ہمرنگ شنون کا دوپٹہ لے کر، بالوں کی ڈھیلی

سی چوٹی بتاتے ہوئے۔ وہ کمرہ لاک کر کے کوریڈور میں نکل آئی۔

دو ہی قدم پر جان چلا آ رہا تھا۔

سر سے لے کر پاؤں تک اُسے شریعہ نظروں سے گھورنے لگا۔

اُس کا رنگ سُرخ ہو گیا۔

جان پاس آ کر رُک گیا۔ تمہنی پلکیں زور زور سے جھپکیں۔

”کیا ہے؟“ اُس کے کانوں کی لوئیں تک سُرخ ہو گئی تھیں۔

”کچھ نہیں۔“ وہ کندھے اُچکاتے ہوئے اب بھی بغور اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”تو پھر ایسا کیا دیکھ رہے ہیں۔“

”آنکھیں میری اپنی ہیں میں جس طرح بھی دیکھوں۔“

”اوہ۔“ وہ تھک کر بولی۔ ”باہر گھومنے چلیں گے؟“

”آں۔ نہیں۔ بہت سا کام دیکھنا ہے۔“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

وہ اچانک اداس ہو گئی۔ پڑ مردہ لگنے لگی۔

دو ہی تو دن رہ گئے تھے۔ جب سے شپ واپسی سفر پر روانہ ہوا تھا۔ جان کو

اس کے پاس رہنے کو وقت ہی نہ ملتا تھا۔

”کام۔ کام۔ کام۔“ اس کی آواز میں اداسی کے ساتھ ساتھ تیزی

کھل مل گئی تھی۔

وہ دیرے سے مسکرا دیا۔

”شام کو چلیں گے۔ کولون تو رات کے اند میرے میں خوبصورت ہو جاتا

ہے۔“ اپنا نیت سے اس کے چہرے پر انگلی سے لیکر بتاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

”شام کو؟“ اس کی مایوسی بڑھ گئی۔ آواز بھڑانے لگی۔

اور جان کو یاد آیا۔ شام کو ایک بار پہلے بھی ناجیہ نے اس کے ساتھ باہر

جانے سے انکار کر دیا تھا۔ بلکہ اس وقت بھی وہ اس کے ساتھ تنہا نہیں اپنی آنٹی

وغیرہ کو ساتھ لے کر جاتی۔ وہاں چند منٹوں کو وہ آنٹی کی نظریں بچا کر اس سے

اکیلے میں بات کر لیتا۔ وہ الگ بات تھی۔

”ہوں۔ شام کو کولون کا حسن کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔“ وہ دانستہ اس کی

مایوسی نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔

اس کی نظروں میں شوخی تھی۔ ہونٹوں پر شریر تبسم پھل رہا تھا۔

ناجیہ پلکیں جھپکانے لگی۔

”خاص طور سے یہاں کے ٹائیٹ کلب...“ اس نے بمشکل اپنی ہنسی روک رکھی تھی۔

اور۔۔۔ تاجیہ کا رنگ بدل سا گیا۔

جان مسکرا دیا۔ وہ بہت Possessive تھی۔

”اچھا میں چلتی ہوں“۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

اب کے اس کے لہجے میں خفگی سی تھی، غصہ سا تھا۔

جان مسکراتے ہوئے مڑ کر چند لمحوں سے دیکھتا رہا۔

اور پھر اپنے کیبن میں چلا گیا۔

تاجیہ آنٹی کے ہمراہ ٹیکسی میں کولون شہر چلی گئی۔

کئی اور پنجرے کے ساتھ وہ دونوں بھی ادھر ادھر مشہور مقامات دیکھنے لگیں۔

کیٹھیڈرل دیکھا، باہر سے جتنا عظیم تھا، اندر سے اس سے بڑھ کر شاندار تھا۔ بلکہ

پرہیز سا، پر عظمت سا تھا۔

پھر وہ لوگ آرٹ میوزیم گئے۔ ایک کے بعد ایک، کئی ہال دیکھ ڈالے۔ ان

گنت موڈرن پینٹنگز دیکھیں۔

اس کے بعد شوپنگ سنٹر میں گئیں۔ کافی دیر تک ادھر ادھر گھوم پھر کر چیزیں

دیکھتی رہیں۔

آخر میں ایک پوینٹ کیفے پر آ کر ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

”May I join you?“ تاجیہ نے اپنے دائیں آواز کی رخ پر دیکھا۔

جان تھا۔ پرکشش ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

دلنشین آنکھوں میں جہاں بھر کی اپنائیت تھی۔

خالی کرسی کی پشت تھامے وہ ان لوگوں کی اجازت کا منتظر تھا۔

تو۔۔۔ وہ آ گیا تھا۔ کچھ دیر قبل شپ پر دانستہ اسے تنگ کر رہا تھا۔

تاجیہ کا مرجھایا چہرہ خود بخود کھل اٹھا۔

اس کی خاطر آج جان نے آنٹی کی موجودگی کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔
 ”Oh Sure.“۔ آنٹی خوش ہو کر بولیں۔

وہ دونوں کے دلوں کا حال بڑے دنوں سے جانتی تھیں۔ اور یہ بھی — کہ جان برا شخص نہیں تھا۔ اور یہ بھی — کہ جان جیسا کئی شیپوں کا انکوتا وارث کسی قسمت والی لڑکی کو ہی مل سکتا تھا۔

جان نے کوئی کا آرڈر دیا۔ کوئی پینے کے دوران وہ آنٹی سے ہی باتیں کرتا رہا۔ کولون سے متعلق ہی۔

گو نظریں بار بار تاجیہ کی طرف بھٹک جاتیں۔
 تاجیہ خوش بھی تھی، اداس بھی۔

خوش جان کی قربت کی وجہ سے تھی۔ اداس دودن کے بعد کی اس سے جدائی کی وجہ سے تھی۔

”مسز مصطفیٰ آپ سامنے کی دکان پر جانا پسند کریں گی۔“ کوئی کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اچانک جان سڑک کے اس پار ایک دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں بیٹا۔“ پھر جیسے وہ کچھ سمجھ سی گئیں۔ تم تاجیہ کو ساتھ لے لو۔ میں یہیں انتظار کروں گی۔ جاؤ تاجیہ تم ہو آؤ۔“

تاجیہ جانتی تھی آنٹی سب سمجھتی تھیں۔ کوئی تکرار یا انکار مناسب نہ سمجھا۔ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمہاری آنٹی ونڈرفل ہیں۔“ آگے بڑھتے ہی جان بول اٹھا۔

”دل کی بات فوراً سمجھ لیتی ہیں۔“

”بائے داوے آپ اس وقت کیسے آ گئے۔ آپ کو تو کام تھا۔“ ساتھ ساتھ

چلتے تاجیہ نے کہا۔

”کیا تھوڑا سا۔۔۔ پھر منبر کے حوالے کر کے آ گیا۔ تم سے جیت سکتا ہوں کبھی۔“

”جس وقت آپ کو لون کی شام کے حسن کی تعریف کر رہے تھے۔ آپ کا ارادہ تھا اس وقت آنے کا۔“

”بالکل تھا۔“ اُس کے لبوں پر شریر ہنسی چل رہی تھی۔
”پھر بھی آپ شام کو آنے کا کہہ رہے تھے۔“

”صبح واقعی میرا خیال تھا کہ دن کو کام نمٹالوں گا۔ شام کو تمہارے ساتھ آؤں گا۔ لیکن — تم نے یاد دلایا کہ تم شام کو میرے ساتھ نہیں آ سکو گی تو ارادہ بدل دیا۔
”غیر کو کام سمجھا کر چلا آیا۔“

”اور وہ آپ کا ٹائٹ کلب؟“

”شام ابھی باقی ہے۔“ وہ ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

اور — تاجیہ پھر سے خفا خفا غصہ غصہ نظر آنے لگی۔

”تو آپ شام کو ہی آ جاتے اس وقت آنے کیا ضرورت تھی۔“

”تمہیں اداس دیکھ سکتا ہوں؟“

”میں اداس نہیں ہوتی۔“ وہ دکان کے اندر گھسنے لگی۔

”یہاں نہیں میم۔“ اس نے اسے ہاتھ سے کھینچا۔ ”وہاں پارک میں۔“

اس نے قریبی لوکل پارک کی طرف اشارہ کیا۔ ”دکان کا تو میں نے بہانہ بنایا

تھا۔ آؤ۔ آنٹی نہیں دیکھ رہیں۔“

آنٹی واقعی کوئی پیتے پیتے اپنے سامنے سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو تک رہی تھیں۔

وہ چپ چپ سی ساتھ ہوئی۔

”کیا بات ہے؟“ بچ پر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے وہ بغور اس کے

چہرے کو دیکھنے لگا۔

وہ اب بھی خفا تھی، غصہ تھی۔

”مجھے؟“ کلب کبھی اچھے نہیں لگے۔ خوش۔“ وہ دلنشین انداز میں بولا۔

اور— تاجیہ مسکرا دی۔

کتنی دیر سے اسے پریشان رکھا تھا۔

کبھی ساتھ نہ آنے پر — کبھی معنی خیز انداز میں کولون کی شام کے حسن کا ذکر کر کے — اور کبھی ٹائٹ کلب کی تعریفوں پر —
 ”کچھ پیو گی؟“

اس نے سر آہستہ سے نفی میں ہلا دیا۔

”کھاؤ گی۔“

اس نے دوبارہ سرنفی میں ہلا دیا۔

جان اس کے انداز پر مسکور سا مسکرا دیا۔

”منہ سے نہیں بولو گی۔“

ایک بار پھر اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ جانے کیوں وہ اچانک اداس لگنے لگی۔

”خفا ہو۔“

وہ خاموشی سے اسے تیکنے لگی۔

”کہہ تو دیا ہے مجھے ٹائٹ کلب سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

وہ اب بھی چپ چاپ اسے تکتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

”کیا بات ہے، ہاں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

اس کی شرتی آنکھوں میں رنگوں کی دھند چھا گئی۔ بدلیاں آپس میں گڈمڈ

ہوئیں۔ اور قطرے چھلک پڑے۔

وہ سمجھ گیا وہ اس سے ہٹھڑ جانے کے خیال سے اداس تھی۔

وہ بھی بے کل ہو گیا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں پر اٹھاتے

ہوئے اسے تسلی دی۔

وہ بچوں کی طرح رو دی۔
 ”روؤ نہیں پلیز۔“ اس نے اس کا سراپے پہلو سے لگا لیا۔ ”تھوڑا سا وقت
 ہے ہمارے پاس، تمہیں رو کر نہیں گزارنا چاہئے۔ چلو شاہاش مسکرا دو۔“
 تاجیہ نے آنسو پونچھ لئے۔
 مگر وقفہ وقفہ سے ہچکیاں لیتی وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔
 ”مسکرا دو نا۔“
 ”نہیں۔“ وہ مسکرا دی۔
 "that's it" - آئندہ رو نا نہیں۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔ کوئی مستقبل کا
 پلان بناؤ۔ ہمارا گھر ہوگا، بچے ہوں گے ...“
 ”چلیں واپس چلتے ہیں۔“ اس کے لب و لہجے پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے
 ہنسی آ گئی۔ ”آئی انتظار کر رہی ہوں گی۔“
 شام کو جان پھر مصروف تھا۔ ریسپشن آفس میں بیٹھا فائیلوں، رجسٹروں کی
 جانچ پڑتال کر رہا تھا۔
 تاجیہ آنٹی کے ساتھ لاؤنج میں کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی ایک میگزین دیکھ
 رہی تھی۔
 آنٹی اخبار پڑھ رہی تھیں، گا ہے گا ہے تاجیہ کے ساتھ کسی خبر پر بات چیت
 کر لیتیں۔ اور پھر دوبارہ مطالعے میں مصروف ہو جاتیں۔
 تبھی مجتبیٰ اندر داخل ہوا۔ حسب معمول مہ پارہ ساتھ تھی۔
 آج مجتبیٰ اسے ان دونوں کی طرف لے آیا۔
 آنٹی اخبار ایک طرف رکھ کر ان سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔
 تاجیہ نے بھی میگزین بند کر دیا۔ مہ پارہ کا حال پوچھا۔
 مگر۔۔۔ اس نے محسوس کیا۔ مہ پارہ کا لب و لہجہ اس کے ساتھ دوستانہ نہ تھا۔ بلکہ
 کچھ تنگ سنا، طنز یہ ساتھ تھا۔

تاجیہ نے بارہا اس سے قبل بھی اس کی نظریں اپنے اوپر تلخ اور طنزیہ ہی پڑتی دیکھی تھیں۔ وجہ وہ جانتی تھی۔ مہ پارہ جان کی طرف مائل تھی اور خود جان تاجیہ کی طرف۔

”آئی میں ذرا اپنے کیمین میں جاؤں۔“ تاجیہ نے ہال سے چلے جانے میں ہی بہتری سمجھی۔

”کیمین میں یا...“ مہ پارہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کا لہجہ گہرا طنز لئے تھا۔

تاجیہ نے دیکھا۔ مجتبیٰ بھی اس کے رویئے اور لب و لہجے سے خفیف سا نظر آ رہا تھا۔

”اچھا آئی۔“ تاجیہ نے بمشکل کہا۔

اور اٹھ کر نیچے کیمین میں آ گئی۔

شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ شپ پر کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ اس نے کیمین کی بتی نہیں جلائی۔ یوں ہی تھکے قدموں سے چلتی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

وسیع و عریض شپ ساکت کھڑا تھا۔ کبھی کبھار ایک آدھ بارج پاس سے گزرتی تو تھوڑا سا ہانپ کا نپ جاتا اور پھر دوبارہ وہی سکوت چھا جاتا۔

چمکتے پانیوں پر شام بسیرا کر چکی تھی۔ ہوا بخ بستہ ہو گئی تھی اور دور پار سے پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی سمت چل پڑے تھے۔

”اے میم۔“ کمرے میں اچانک روشنی ہو گئی۔

وہ گھبرا کر پیچھے مڑی۔

جان تھا۔ اب بھی ادھ کھلے دروازے میں کھڑا سوئچ پر ہاتھ رکھے تھا۔

”کچھ سنائی دے رہا ہے؟“ اس کا اشارہ ڈزنیل کی طرف تھا۔ جیسے واقعی وہ اپنی محویت میں نہ سن پائی تھی۔ ”ڈزنگ ہو رہا ہے۔“

وہ یوں ہی کھڑی اسے جکتی رہی۔

”بھوک نہیں لگی؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”نہیں۔“ وہیں کھڑکی کے پاس کھڑی اس نے سرنگی میں ہلا دیا۔

”کھانا کھانے نہیں جاؤ گی؟“

”نہیں۔“ اس نے سر دوبارہ انکار میں ہلا دیا۔

وہ جان بوجھ کر جان کو تنگ کر رہی تھی۔

”خفا ہو؟“ اس نے حسب سابق پوچھا۔

اور — ناجیہ نے سرد میرے سے اثبات میں ہلا دیا۔

خفا تو وہ تھی — کتنی دیر تک وہ کاموں میں لگا رہا تھا۔ صرف دو ہی تو دن

تھے اور — پھر جانے وہ کہاں ہوتی؟ اور جان کہاں؟

”اوہ۔“ کچھ کہے بنا جان واپس چل دیا۔

ناجیہ حیران سی ادھ کھلے دروازے کو جکتی رہ گئی۔

کیا جان بھی ناراض ہو کر چلا گیا تھا؟

مگر — ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

ایسی تکرار تو اکثر ان دونوں کے درمیان چلتی رہتی تھی۔

گہری اداس سانس لے کر وہ دوبارہ کھڑکی کی طرف مڑی۔

اب تو واقعی وہ ڈر پر نہیں جاسکتی تھی۔ جان سے کہہ جو دیا تھا اسے بھوک نہیں تھی۔

مگر — جان — وہ کیوں اس طرح اچانک چل دیا تھا۔ ایسی تکرار اس کے

لئے کوئی نئی تو نہ تھی۔ ساری شام بھی کاموں میں لگا رہا۔

اس وقت ذرا سی جھلک دکھائی تو وہ بھی... جانے کیوں اس کی آنکھیں نم ہو

گئیں۔

جب سے واپسی سفر شروع ہوا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کا دل بھر آتا۔

کھڑکی کی پٹ سے سرفیک کر بازو آنکھوں پر رکھ کر وہ چپکے سے رو دی۔

معا دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔
چونک کر وہ آنسو پونچھنے لگی۔ سیورڈیس تھی، کھانے کی ٹرے ہاتھ میں لئے تھی۔

تو— جان نے اس کے لئے کھانا بھجوا دیا تھا۔

وہ مزید اداس ہو گئی۔ وہ اسے ساتھ بھی تولے جاسکتا تھا۔ اصرار کر کے۔
اس کی اجازت پا کر سیورڈیس اندر آ گئی۔ ٹرے میز پر رکھی اور واپس چلی گئی۔

اب اس کا دل واقعی کھانے کو نہیں کر رہا تھا۔

اس نے ٹرے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دروازہ بند کیا اور واپس کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

اب اس کے آنسو تو اتر سے بہہ نکلے۔

آنکھیں بازو سے ڈھکے وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

”ٹھک ٹھک ٹھک“۔ دروازہ ایک بار پھر بج اٹھا۔

آنکھوں سے بازو ہٹا کر وہ بند دروازے کو دیکھنے لگی۔

”ٹھک ٹھک“۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ اور ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

جان اندر داخل ہوا۔

”مجھے بھوک لگی ہے۔ اجازت کا انتظار نہیں کر سکتا۔“ وہ اطمینان سے میز کی

طرف بڑھا۔ پلیٹ ہاتھ میں اٹھائی۔ ”آؤ“۔ اور پھر— وہ چونکا۔ وہ تو ہچکیاں لے رہی تھی، رو رہی تھی۔

اس نے پلیٹ واپس رکھ دی۔ تاجیہ کے قریب چلا آیا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے تشویش سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ بمشکل بولی۔

”کل کا سارا دن تمہارے پاس۔ خوش۔“ اس کے آنسو اٹکیوں سے صاف

کرتے ہوئے وہ اپنائیت سے بولا۔

تاجیہ روتے میں مسکرا دی۔ کتنی جلدی وہ اس کی خفگی جان گیا تھا۔
اچانک اس کی نظر کھانے کی ٹرے پر پڑی۔ دو آدمیوں کا کھانا لگا تھا۔
اس کا اور جان کا — کتنا غلط سوچا تھا اس نے تھوڑی دیر قبل۔
وہ نادم ہی کتنے لگی۔

”آؤ — کھانا کھالو۔“ اسے ہاتھ سے تھام کر اس نے میز سے لگی کرسی پر بٹھا دیا۔

خود اس کے سامنے ہی میز کے کونے پر ٹنک گیا۔ نیپکن کھولے۔ ایک تاجیہ کے آگے بچھایا ایک اپنی ٹانگوں پر۔ پھر سوپ کا پیالہ ہاتھ میں لے کر تاجیہ کے قریب کر کے، چمچ بھر کر اس کے منہ کے پاس لے گیا۔

کتنی اپنائیت تھی اس کے انداز میں۔
”لو شاباش“ — جیسے وہ چھوٹی سی بچی کو کھلا رہا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی تاجیہ نے منہ کھول لیا۔
دوسرا چمچ بھر کر اس نے خود لے لیا۔

اور — یوں — آہستہ آہستہ پیالہ خالی ہو گیا۔

پھر جان نے پلیٹ میں گوشت نکالا، چاول نکالے۔ اسی انداز میں اسے کھلاتا
اور خود بھی کھاتا رہا۔ آخر میں دونوں نے پڈنگ کھائی۔ جان نے نیپکن سے ہاتھ صاف کئے۔

اور — اٹھ کھڑا ہوا۔

”اور اب جاتا ہوں۔“ جھکے ہوئے اس نے ہنوز کرسی پر بیٹھی تاجیہ کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ”کل کا سارا دن تمہارے پاس — ہاں۔“ وہ اپنے مخصوص دلنشین انداز میں بولا۔

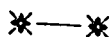
تاجیہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جاؤں؟“

ناجیہ نے جھکی پٹکیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بس۔

”گنڈ ٹائیٹ۔“ اس نے ہو لے سے اس کا گال تھپتھپایا۔

اور نپے تلے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر چلا گیا۔





آج ایک بار پھر انہوں نے سرحد پار کیا۔
 اور ایک دفعہ پھر وہ لوگ ہالینڈ میں تھے۔
 کسٹمز آفیسرز نے آخری بار ان کے پاسپورٹ چیک کئے۔
 جان واقعی صبح سے اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ کبھی آنٹی کی نظریں
 بچا کر۔ تو کبھی ان کے سامنے ہی۔
 ”یہاں کسی بھی وقت سیلاب آ سکتا ہے۔“ دور پانیوں پر نظریں جمائے جان
 کہنے لگا۔ ”گیارہویں صدی کے قریب تمام ہالینڈ سمندر کی زد میں آ گیا تھا۔
 دوبارہ بند وغیرہ باندھ کر زمین کو پانی سے خالی کرایا گیا تھا۔ اب بھی دن رات
 تمام علاقے میں پانی کا لیول کنٹرول کرنے کے حفاظتی تدابیر کئے جاتے ہیں...“

”ہالینڈ بہت خوبصورت ہے۔“ ناجیہ تاحہ نظر پھیلی سرسبز مچلیں چراہ گاہوں
 اور ان پر چرتی چتکبری گائیوں پر نظریں جمائے مسوری بولی۔
 ”ہاں — چراہ گاہیں“ گائے ڈیری فارم“ ونڈ ملزل کرتو ہالینڈ کہلاتے ہیں۔“
 ”ایک چیز آپ بھول رہے ہیں۔“
 ”وڈن شوز — ہاں۔“
 ”ہاں۔“

اور دونوں بے اختیار ہنس دیئے۔
 شام تک وہ لوگ Nijmegen پہنچ گئے۔ رات شپ نے یہیں رکنا
 تھا۔ عملہ اسے ستونوں سے باندھنے میں تیزی سے مصروف ہو گیا تھا۔
 اداس، اداس — چپ چپ سی ناجیہ جان کے ساتھ اس وقت پھر ڈیک پر
 کھڑی اطراف پر نظریں دوڑا رہی تھی۔
 رات ڈنر پر جان کیپٹن کے یہاں مدعو تھا۔ ناجیہ نے کھانا مسٹر اور مسز مارٹن
 کے ساتھ لاؤنج میں اپنی میز پر کھایا۔ پھر آنٹی کے ساتھ ان کے کیمپ میں چلی آئی۔

اگلے دن صبح سویرے شب Nijmegen سے چل کر ریور رائین میں سے
ہالینڈ کے کیناٹز میں آ گیا۔

ایک بار پھر وہ لوگ لوکس میں سے گزرے تھے۔ یورپ کے سب سے بڑے
اندرونی لاک میں سے جس میں سے تقریباً ساٹھ ہزار شب سالانہ گزرتے تھے۔

اب وہ لوگ پھر اپنے راستے پر کیناٹز میں رواں دواں تھے۔
کناروں پر لہلہاتی سرسبز گھاس تھی اور ادھر ادھر وٹ ملز بکھری نظر آرہی
تھیں۔

آج جان بہت سویرے بیدار ہوا تھا۔ اس وقت ریپشن ڈیسک کے پیچھے
آفس میں مصروف تھا۔

جلد سے جلد کام سے نمٹ کر وہ آج کا آخری دن اور زیادہ سے زیادہ وقت تاجیہ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔

آج صبح سے ہی تاجیہ بہت اداس تھی۔ کوشش کے باوجود سنبھل نہیں پارہی تھی۔ آج کی رات اور بس۔

کل صبح ہی صبح انہوں نے شب چہوڑ دینا تھا۔

شب — وہ بھی تو اسے اچھا لگنے لگا تھا — چلتا پھرتا گھر جیسا۔ اس نے اس میں تقریباً دو ہفتے گزارے تھے اور پھر۔

روز اول سے ہی جان سے مڈ بھٹ بھی تو ہوئی تھی۔ کئی واقعے، کئی باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔ کئی تلخ واقعے، کئی خوبصورت باتیں۔

مجتبیٰ اور مہ پارہ کے اوپر آ جانے سے اس کی محویت ٹوٹی۔

”اکیلی ہو — جبکہ آج تو خاص طور سے تمہیں شب اوز کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔“ چھوٹے ہی مہ پارہ بولی۔ اس کے لہجے کا طنز مجتبیٰ سے بھی چھپا نہ رہ سکا۔

تاجیہ مجتبیٰ کے سامنے اتنے کھلے الفاظ میں جان کے ذکر پر سرخ سی ہو گئی۔ مہ پارہ کے لب و لہجے پر غصہ بھی آیا۔

مگر — چپ رہی۔ کہ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد معذرت کر کے نیچے لاؤنج میں چلی آئی۔ لائبریری سے ایک میگزین نکال کر یوں ہی ورق گردانی کرنے لگی۔

لنچ ٹائم کے قریب جان بھی فارغ ہو کر آ گیا۔

دونوں نے اپنی میز پر مسر اور مسز مارش کی ہمراہی میں کھانا کھایا۔ پھر لاؤنج میں ہی کھڑکی کے قریب کرسیوں پر بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

ایمسرڈیم بھی آ گیا۔ شب آخری بار نگر انداز ہوا۔

آج آنٹی سے خاص طور سے اجازت لے کر جان اسے ایمسرڈیم گھمانے

لے گیا۔

وہ دونوں واٹر بس میں بیٹھ کر شہر کے کینالز سے گزرنے لگے۔

بس اس اٹھاؤ پل کے نیچے سے بھی گزری جو ستارویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ راستے میں ایمسٹرڈیم کا سب سے چھوٹا گھر بھی دیکھا۔ جان نے اسے یہ بھی بتایا کہ ایمسٹرڈیم میں تقریباً نو سو تیس ہل قریباً سو کینالز پر سے گزرتے تھے۔ انہوں نے مشہور سات ہل بھی دیکھے۔

وہ چرچ بھی دیکھا جہاں Rembrandt کو دفنایا گیا تھا۔ وہ سارا وقت جان کے ساتھ ایمسٹرڈیم میں گھومتی رہی۔

ایمسٹرڈیم جہاں ٹراموں کا شور تھا، ملوں کے ہجوم تھے، پرانی عمارتیں تھیں اور گلیوں میں لوگوں کی رونقیں تھیں۔

شام کے سائے پھیلنے سے قبل وہ دونوں شب پر لوٹ آئے۔

شام اس نے آنٹی کے ساتھ گزاری۔ کھانا حسب معمول اپنی اپنی میزوں پر کھایا۔ رات دیر تک سب اپنا اپنا سامان باندھتے رہے۔ وہ بھی مصروف تھی۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی دنگ ہوئی۔

اس نے دروازہ کھولا۔ جان تھا۔

”صبح شاید سب کے سامنے میں تمہیں سی آف نہ کر سکوں۔“ وہ قدرے رکا۔

مسکرایا۔ ”اپنا خیال رکھنا۔ ہاں۔“

وہ چپ چاپ اسے نکلتی رہی۔ کہتی بھی کیا۔ کہ بولنے کو کچھ تھا جو نہیں۔

”میں تمہیں لنڈن خط لکھوں گا۔“ اس نے مزید کہا۔ اس کا ہاتھ تھا۔ آہستہ

سے ہونٹوں سے لگایا۔ ”او کے گڈ نائٹ۔“

وہ اب بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اب بھی کچھ نہیں بولی۔ کہ اب تو آواز ہی

ساتھ نہ دے رہی تھی۔

اسے دیکھتے دیکھتے جان دو قدم چل کر اپنے کیمن میں چلا گیا۔

اور — ناجیہ کو لگا۔

دھرتی گردش کرتے ہوئے اچانک رک گئی ہے۔ کائنات تھم گئی ہے۔
خود اس کا وجود جواب دینے لگا ہے۔ دل کی دھڑکن ٹھہرنے لگی ہے۔
وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی رہی۔ رات گزرتی رہی۔
اسے لگتا تھا۔ اس نے ایک حسین پسند دیکھا تھا۔
جس سے وہ اس وقت جاگ اٹھی تھی
سامنے کچھ نہیں تھا، سوائے مایوسیوں کے، ناامیدیوں کے۔

✱ — ✱

صبح ہی صبح مسافروں نے شپ چھوڑ دیا۔ بس انہیں ہک آف ہالینڈ پہنچانے
تیار کھڑی تھی۔

تاجیہ آنٹی کے ساتھ کھڑکی کے قریب بس میں بیٹھ گئی۔
ایک نظر چمکتے دکتے شپ پر ڈالی۔ اس کا اوزر شاید اب بھی اپنے کیبن میں سو
رہا تھا۔

آج ہی اس نے بھی لندن بائے ایئر جانا تھا۔
کوچ انہیں لے کر دیہاتی علاقوں سے گزری۔ سرسبز اور زرخیز سبزہ زاروں
کے درمیان سے۔

حسب سابق وہ لوگ تار تھری کو فیری پر بیٹھ کر عبور کرنے لگے۔ شپ کے

پنجرز یہاں بھی موجود تھے۔ جیسے اپنے ہوں سب۔
وہیں انہوں نے مل کر پنچ کھایا۔

انگلینڈ کے ساحل پر پہنچ کر وہ لوگ ہاروج سے لنڈن جانے کے لئے ٹرین میں بیٹھ گئے۔

لنڈن قریب آنے لگا۔ تو پنجرز ایک دوسرے کو الواداع کہنے لگے۔ مسز اور مسز مارٹن نے ناجیہ کو خاص طور سے خدا حافظ کہا۔ مسز براؤن اور آنٹی نے ایک دوسرے کو ملنے رہنے کی تاکید کی۔ مہ پارہ تو وہیں پچھلی سٹریٹ میں رہتی تھی۔ مجتبیٰ سے ملنے رہنے کا وعدہ دے دلا رہی تھی۔ ٹرین سے اتر کر وہ آنٹی اور مجتبیٰ کے ہمراہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کے لئے روانہ ہوئی۔

تو جانے کیوں ابے یقین ہونے لگا۔
پچھلے چند دن جو وہ ایک سہانا مسکور کن سپنا دیکھ رہی تھی۔
وہ خواب ہی تھا، حقیقت نہیں۔
شپ اس کا اوزر۔ سب واہمہ تھا۔
اور جس کا۔ دور سے بھی سچائی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

لنڈن کے مضافات میں انکل مصطفیٰ کا دو بیڈروم کا چھوٹا سا خوبصورت گھر تھا۔
اسی میں مجتبیٰ کا بیڈروم آنٹی نے تاجیہ کو دے رکھا تھا۔ مجتبیٰ کو انہوں نے اپنے پاس بلا
لیا تھا۔

وہی ماحول جو دو ہفتے قبل اسے بہت اچھا لگا تھا۔

اب — چپ چپ، اداس اداس لگ رہا تھا۔

وہ بظاہر آنٹی کا، مجتبیٰ کا، باتوں میں، گھومنے پھرنے میں ساتھ دیتی۔ مگر اندر
ہی اندر جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔

اسے بیس دن اور یہاں رہنا تھا۔ پھر اس نے ابو کے ساتھ واپس پاکستان چلے
جاتا تھا۔ ابو فرانس سے واپس آ چکے تھے۔ مگر اب بھی لنڈن میں معروف تھے۔

ناجیہ انکل مصطفیٰ کے گھر آرام سے تھی۔ انہیں معلوم تھا اور اسی لئے مطمئن تھے۔ وہ روزانہ ڈاک کا انتظار کرتی۔ جان نے اسی دن لنڈن آتا تھا جس دن یہ لوگ ایمسٹرڈیم سے چلے تھے۔

اور۔۔۔ لنڈن سے ہی اس نے اسے خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ بقول جان کے اس کے انکل مصطفیٰ کا اور اس کا پاکستان کا ایڈریس تو اسے زبانی یاد تھا۔ شب پر پہنچتے ہی اس کے پاسپورٹ پر جو نظر پڑی تو ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ مگر۔۔۔ آج۔۔۔ پورے بارہ دن ہو گئے تھے۔

کوئی خط نہیں آیا تھا۔ اور۔۔۔ جان کو معلوم تھا اس نے صرف بیس دن لنڈن میں اور گزارنے تھے۔

پتہ نہیں کیوں؟ اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

شب اور اس کا اونرگو واہمہ لگتے تھے۔ مگر پھر بھی اسے اس کے خط کا انتظار رہتا۔ روزانہ صبح سویرے وہ ہی دروازہ کھول کر دودھ کی بوتلیں اٹھانے کے بہانے دو چار قدم پر چھوٹے سے باغچے کے سرے پر لگا میل بوکس کھول کر دیکھتی۔ شاید ڈاکیہ جان کا خط ڈال گیا ہو۔

اور پھر۔۔۔ تین دن اور گزر گئے۔

پورے پندرہ دن۔۔۔ کوئی خط نہ آیا۔ وہ مایوس ہوتی گئی۔

ایسے میں ایک مجتبیٰ تھا۔ جو اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

شب میں دو ہفتے کے دوران وہ دونوں کا بغور مطالعہ کر چکا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے۔ یقیناً جان نے خط، فون وغیرہ کا وعدہ کیا ہوگا۔ ناجیہ کی متلاشی، بیقرار نگاہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر باہر جا کر میل بوکس کی متلاشی لینا۔ اور۔۔۔ چہرے پر مایوسی لئے واپس لوٹنا۔ صاف بتاتے تھے پھر؟ پھر کیوں نہیں آج تک جان نے اسے اپنی کوئی خیر خبر دی؟ کہیں۔۔۔ محض فلرٹ تو نہیں کر رہا تھا؟

وہ چونکا۔

کئی بحری جہازوں پر مشتمل بحری بیڑے کا اکلوتا مالک۔ جس کے آگے پیچھے
کئی کئی لڑکیاں پھرتی تھیں۔ ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔
فلرٹ ہی کر رہا ہو۔

اوہ پروردگار! مگر۔ تاجیہ توج سمجھ بیٹھی تھی سب۔
اب۔ اب کیا ہوگا؟

وہ زیادہ سے زیادہ اس کا دھیان ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔
وہ تاجیہ کی بہت قدر کرتا تھا۔ ایک تو وہ اس کے باپ کے جگری دوست کی
بیٹی تھی۔ دوسرے وہ اپنی اچھی عادتوں اور پاکیزہ خیالات کی وجہ سے اس کے دل
میں گھر کر گئی تھی۔
گو اس کے من میں بھی خواہش اٹھی تھی۔ کہ وہ تاجیہ کو اپنا سکا ہمیشہ کے لئے۔
کہ ایسی لڑکیاں قسمت سے ملتی ہیں۔

مگر۔ اسے جان کی طرف مائل پا کر۔ اس نے اپنی سوچ کا اندازہ بدل
دیا تھا۔ اور۔ خلوص دل سے دونوں کے ایک ہو جانے کی خواہش کی تھی۔
مہ پارہ ہر دوسرے روز آ جاتی تھی، بلکہ آج کل تو روز آنے لگی تھی۔ مجتبیٰ بھی اس
کا ساتھ دیتا، اس کے ساتھ باہر گھومتا پھرتا مگر۔ تاجیہ کی اسے برابر فکر لگی تھی۔
کبھی دل میں آتا کھل کر اس سے بات کر لے۔ جان نے کیوں آج تک
اسے کوئی اطلاع نہیں دی؟ کیوں وہ خود ہی اسے خط نہیں لکھ دیتی؟ فون کیوں
نہیں کر دیتی؟

مگر پھر سوچتا۔ وہ شرم و حیا میں پٹی بڑھی لڑکی تھی۔ شاید اچھا نہ سمجھتی۔ یا پھر
اسے کچھ بتاتی ہی نہیں۔

دن بہر حال گزر رہے تھے۔ خط نہ آتا تھا، نہ آیا۔
تاجیہ کہلا کر رہ گئی تھی۔ اداسی نے اس کے خوبصورت چہرے پر تاریک

سائے بکھیر دیئے تھے۔

پھر۔۔۔ وہ دن بھی آیا۔ جب وہ ابو کے ساتھ پاکستان جانے کے لئے
اداس اداس سی ایئر پورٹ پر کھڑی تھی۔

”مجتبیٰ آنٹی اور انکل بھی انہیں الوداع کہنے موجود تھے۔
”مجتبیٰ بھائی۔“ تاجیہ بالکل چپکے سے بولی۔ ”میرا کوئی خط آ جائے تو
پاکستان بھیج دیجئے گا پلیز۔“

مجتبیٰ سمجھ گیا اس کا اشارہ جان کے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں تھا۔
وہ مسکرا دیا۔ اداس سا۔

ایک نظر تاجیہ کو دیکھا۔
وہ تو جیسے رو دینے کو تھی۔

وہ۔۔۔ اپنی اداسی بھول گیا۔

یہ تو خط تھا۔ وہ تو اس کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔

”بالکل۔ تم فکر نہ کرو۔“ وہ خلوص سے مسکرایا۔

اور یوں۔۔۔ تاجیہ نے اپنے دل کا معصوم راز مجتبیٰ کو منتقل کر دیا۔

پاکستان آئے اسے مہینہ ہونے لگا تھا۔ مگر اب تک مجتبیٰ نے جان کا کوئی خط ارسال نہیں کیا تھا۔

اس کا بی اے کارزلٹ بھی آچکا تھا۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی تھی۔ کالج جا کر اپنی دوستوں، کلاس فیلوز سے بھی مل آئی تھی۔ اگلے شہر جا کر یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لینے کا پروگرام بھی بن رہا تھا۔ مگر — اس کی معصوم خوشیاں جانے کہاں روٹھ گئی تھیں۔

جہاں امی اور ابو کا پیار، گھر کا پرسکون ماحول اس پر مسرتوں کے خزانے لٹاتا۔ کالج سے چھٹی ہوتے ہی وہ گھر پہنچنے کے لئے بے تاب رہتی۔

اب وہی پیار — وہی پرسکون مسرتیں جیسے ناکافی تھکنے لگی تھیں۔ جیسے اجنبی

اجنبی ساتھ سب کچھ۔

کاش! وہ انگلینڈ نہ گئی ہوتی۔ یا کاش وہ آنٹی اور مجتبیٰ کاشپ پر سیر کا پروگرام کینسل کروادیتی۔

اسے تو ایک چپ لگ گئی تھی۔ نہ وہ امی کے ساتھ کپ شپ۔ نہ وہ ابو سے تازہ برداریاں۔

ابو تو آفس سدھا رہ جاتے۔ مگر امی سے اس کی حالت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ بہت پوچھا، بہت اصرار کیا۔ مگر۔ وہ کہتی تھی تو کیا؟

جان۔ شپ اونر۔ بقول اس کے اسے چاہتا تھا۔

وہ بھی اسے چاہنے لگی تھی۔ مگر۔

سب خواب و خیال نکلا۔ بیس دن وہ لنڈن رہی تھی۔ خط آتا ہوتا تو تب ہی آجاتا۔

ماہ بھر پاکستان آنے کو ہو گیا تھا۔ خط آیا ہوتا تو مجتبیٰ بھیج نہ دیتا۔

اور پھر۔ اب تو۔ وہ چاہتا تو اسے براہ راست پاکستان میں بھی خط لکھ سکتا تھا۔ کہ بقول اس کے اس کا پاکستان کا ایڈریس بھی اسے زبانی یاد تھا۔ پھر؟ کیا وجہ تھی؟

اسے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے۔ اس کا دلنشیں انداز، مسکور کن لہجہ۔ دلچسپ باتیں یاد آتیں۔

وہ بیقرار ہو ہواٹھتی۔

کبھی دل میں آتا۔ خود اسے خط لکھے۔

مگر۔ دوسرے ہی لمحے خیال آتا۔ جان نے اتنی باتوں، اتنی ملاقاتوں میں ایک بار بھی تو اسے خط لکھنے کو نہیں کہا تھا۔

کیسے وہ خود اسے خط لکھتی؟ خود داری بھی تو آڑے آتی تھی۔

پھر۔ اس نے اسے اپنا لنڈن کا یا پیرس کے اپارٹمنٹ کا یا پھر ایمسٹرڈیم کا۔

کسی بھی جگہ کا تو ایڈریس نہیں دیا تھا۔ وہ لکھنا چاہتی بھی تو کہاں؟
 اور پھر۔۔۔ وہ اتنے دنوں میں اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہ پا کر سمجھ ہی گئی
 تھی۔ کہ وہ دو ہفتے پہلی کھیل سمجھ کر جان بھلا چکا تھا۔
 مگر۔۔۔ اس نے اتنی زیادتی کیوں کی تھی؟ اس کا تصور کیا تھا؟
 لڑکی کے جذبات سے کھیل کر۔۔۔ لڑکا اپنی راہ لیتا ہے۔ اس نے اکثر سن
 رکھا تھا۔ پھر بھی۔۔۔ جب اپنے اوپر آئی۔ تو سینکڑوں توقعات وابستہ کر لیں۔
 کاش! وہ یہی بات وہیں سوچ لیتی۔ کاش! اس کی پر فریب باتوں میں نہ
 آتی۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
 اب تو۔۔۔ اب تو اداسیاں ہی اداسیاں تھیں، دکھ ہی دکھ تھے۔
 اس کی آنکھوں میں اداسیاں اتر آئی تھیں۔ سانسوں تک میں دکھ سرایت کر
 گئے تھے۔

کیوں کیا تم نے جان ایسا؟ اتنی زیادتی کیوں کی میرے ساتھ؟
 کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا؟ کس بات کا بدلہ لیا مجھ سے؟ 'ٹن'۔ 'ٹن'۔ 'ٹن'۔
 'ٹن'۔ 'ٹن'۔ کوریڈور کے کلاک نے پانچ بجائے۔

ہاتھ بڑھا کر اس نے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ صبح کی پسیدی نمودار ہو رہی تھی۔
 تھکی، مضطرب سی وہ انھی۔ وضو کیا، نماز پڑھی۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔
 اور۔۔۔ رب العزت سے اپنے لئے خلوص دل سے سکون دل کی دعا مانگی۔
 جا، نماز تہہ کرے۔ وہ پیچھے چمن میں امی اور ابو کی طرف آگئی۔
 حسب معمول وہ دونوں نماز سے فارغ ہو کر چمن میں کرسیوں پر بیٹھے چائے
 پینے میں مصروف تھے۔

”آؤ بیٹا آؤ۔“ ابو شفقت سے مسکراتے ہوئے بولے۔ تیسری کرسی اسی کے
 لئے لگی ہوتی تھی۔ کھینچ کر وہ اس پر بیٹھ گئی۔

”ابو داخلے کے دن نکل رہے ہیں۔ آپ وقت نکال کر شہر لے جائیں
تو...“

ابھی ابھی اس نے فیصلہ کیا تھا۔ شہر جا کر ہوٹل کے نئے ماحول میں شاید اس
کا دھیان بٹ جاتا۔

”ہاں بیٹا کیوں نہیں۔ کون سا مضمون لینے کا سوچا ہے؟“
”انگلش۔“

”ویری گڈ۔ کل کیا دن ہے؟“ وہ اپنی ڈیوٹی کے متعلق سوچنے لگے۔
”ہاں کل ٹھیک ہے تم آج ضروری کاغذات اکٹھے کر لو۔ کل چلیں گے انشاء اللہ
ویسے۔“ وہ مسکرائے۔ ”تم ہوٹل چلی جاؤ گی تو تمہاری امی اور میں اداس ہو
جائیں گے تمہارے بغیر۔“

”ہاں ابو یہی میں بھی سوچ رہی ہوں مگر...“
”او کے بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”میں اب تیار ہوتا
ہوں۔ تم اور تمہاری امی بناؤ پروگرام آئندہ کے۔“
اور یوں۔ ایم اے میں داخلہ لے کر وہ ہوٹل سدھار گئی۔
نیا ماحول، نئی لڑکیاں۔ وہ آہستہ آہستہ عادی ہو ہی گئی۔
مہینہ بھر ہو چکا تھا اسے آئے۔

پڑھائی زوروں پر تھی۔ دن تو مصروفیت میں گزر جاتا۔ مگر شام اکثر
اداسیاں ساتھ لے کر آتی۔

جان واقعی اسے بھلا چکا تھا۔ ورنہ تین ماہ ہو چکے تھے اسے شپ کے سفر سے
واپس لوٹے، کوئی خط نہ لکھتا اب تک؟ خط آیا ہوتا تو ہر ایک اینڈ پر آتیں امی
ساتھ نہ لے کر آ جاتیں؟

اب تو اسے اس کی یاد کے ساتھ اس پر غصہ بھی آتا۔
بلکہ جب یہ یقین ہونے کے لگتا کہ وہ اسے بھلا چکا ہے۔ تو اپنی توہین کا

احساس بھی ہوتا۔

طرح طرح کے واقعے سراٹھاتے۔ شروع شروع میں شپ پر بھی تو وہ اس کی قدم قدم بے عزتی کر چکا تھا۔ بعد میں پیار جتانے لگا تھا۔ کہیں یہ بھی اسی بے عزتی کی ایک کڑی تو نہیں تھی؟ وہ اپنے ساتھ پیش آئے بچپن کے واقعہ کا اسی سے توبلہ نہیں لے رہا تھا؟ وہ دم بخود سی رہ گئی۔

یقیناً ایسا تھا۔ اوہ پروردگار! اس نے سر تھام لیا۔ اسے تو شپ پر بھی بار بار اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا تھا۔ اکثر سوچا تھا کہاں وہ کہاں جان؟

پاکستان میں جہاں وہ اپنے آپ کو وی آئی پی سمجھتی تھی۔ جان کو دیکھ کر احساس ہوا تھا شان و شوکت کے لحاظ سے وہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی۔ وہ ایک بریگیڈیئر کی بیٹی اور جان — ایک پوری شپنگ کمپنی کا اکلوتا وارث! اس کے درجے کی لڑکیاں تو اسے کسی بھی پورٹ پر مل سکتی تھیں۔ شپ کے ہر تفریحی ٹرپ پر موجود تھیں۔ یہ بدلہ ہی تھا — پیار دیا نہیں۔ لیکن —

اتنی کڑی سزا؟ اس قدر بے اندازہ تو ہیں؟

اور پھر — اس نے سوچا۔

پچھلی کوتاہیوں کا گرچہ کوئی ازالہ کرنا ممکن نہ تھا۔

مگر — اس کے متعلق ہر خیال ذہن سے نکال دینا۔ اسے بھول جانا۔ یہ

سب اپنی تو بھلائی میں تھا نا!

جو ہوتا تھا وہ ہو چکا تھا۔

اس کا مذاق اڑایا جا چکا تھا۔ اس کی بے عزتی کی جا چکی تھی۔

مگر۔ اب اس کے متعلق کسی بھی سوچ کو ذہن میں جبکہ دینا اس کی غیرت کے منافی تھا۔ خودداری کیخلاف تھا۔
 آج کے بعد وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی۔
 اوریوں۔ حتیٰ فیصلہ کر کے۔ وہ اپنی پڑھائی میں لگ گئی۔
 دن سرکنے لگے، دیرے دیرے۔ ہفتے مہینوں میں ڈھلتے رہے ہوئے
 ہوئے۔

✱—✱

یہ اس کتاب کی ایک خاص قسم کی علامت ہے۔

دور، آبادی سے پرے، چمکتے پانیوں کے کنارے تاحد نظر سرسبز زرخیز
چراہ گاہوں میں گھری وسیع و عریض، سفید بالکنیوں والی کوشی میں خاموشی چھائی
تھی۔

پانی کے رخ دور تک پھیلے مچلیں لان کی گھاس قیمتی اور نہایت نفاست سے
تراشی گئی تھی۔ جگہ جگہ کیاریوں میں سفید گلابی اور سیاہی مائل سرخ قیمتی گلاب
مہک رہے تھے۔

سامنے ہی چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں والی تیل ایک اونچے درخت سے
لپٹ کر اسے پوری طرح ڈھکے ہوئے تھی وسیع مرمیں کوشی کی بالکنیوں میں سے
ان گنت قرمزی رنگ کے پھول جھانک رہے تھے۔

نیلگوں آسمان شفاف تھا، سردی سے ٹھٹھرتی کانپتی دھوپ اپنی سہمی سہمی سنہری کرنیں بکھیر رہی تھی۔ اور۔۔۔ ہلکے پھلکے قدم اٹھاتی ایک سبک اندام سی گل مخملیں لان کے آخری حدود پر پانی کے کنارے چلتی ماحول کے حسن کو مزید سحر انگیز بنا رہی تھی۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ مگر کوٹھی میں ابھی تک خاموشی چھائی تھی۔ مکیں سو رہے تھے جیسے اور کوئی کھٹکا کر کے نیند میں غل ہو کر حکم عدولی کرنے کی ملازموں میں تاب نہ تھی شاید۔

پھر اچانک۔۔۔ جیسے کھلبلی سی مچ گئی۔ کوٹھی کے اندر بھی زندگی کے آثار جاگ اٹھے تھے۔ باہر بھی سفید یونیفارم میں ملبوس کئی ملازم ادھر سے ادھر مستعدی سے چلتے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔

غالباً مکیں جاگ چکے تھے۔ اور۔۔۔ ناشتہ وغیرہ دیا جا رہا تھا۔
کچھ دیر اور گزر گئی۔

اور پھر۔۔۔ اچانک سامنے کا بھاری دروازہ کھل گیا۔
سفید یونیفارم ہی میں ملبوس ایک ملازم اس کا پٹ تھا مے کھڑا تھا۔ مودب سا، منتظر سا۔

تبھی رات کے کپڑوں پر گرم قیمتی ٹائیٹ گاؤن پہنے وہ برآمد ہوا۔
بیچھے کی طرف ہاتھ باندھے، آہستہ آہستہ باوقار انداز میں چلتا۔ وہ لان میں نہر کے رخ رکھی سفید پینٹ کی ہوئی کرسیوں کی طرف بڑھنے لگا۔
وہی ملازم تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے لئے کرسی کھینچی۔
”جھینکس۔“ اس نے کہا۔ اور ایک سرسری نظر سامنے بیٹیں پانیوں پر دوڑاتا کرسی پر بیٹھ گیا۔

ملازم مودب طریق سے دو قدم پیچھے ہٹا۔ اور پھر واپس کوٹھی کے پچھواڑے کی طرف بڑھا۔

ٹانگیں میز پر سیدھی پھیلاتے ہوئے اس نے میز پر رکھا اخبار اٹھالیا۔
سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا۔

”ڈاک جناب۔“ یونیفارم میں ملبوس ایک اور ملازم ڈاک کی ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے ڈچ زبان میں بولا۔

”ہوں۔“ اس نے اخبار واپس میز پر ڈال دیا۔ ”تم جاؤ۔“

اور۔۔ ملازم وہاں سے چل دیا۔

کئی خطوط تھے۔ کاروباری، غیر کاروباری، نجی۔

اس کی نگاہیں ایک لفافے پر پڑیں۔ اٹھایا، کھولا۔

دو تصویریں بھی تھیں۔ وہ خط پڑھنے لگا۔

جوں جوں پڑھتا گیا۔ رنگ سفید پڑتا گیا۔

پھر۔ خط اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔

سرکسی کی پشت سے جائکا۔ آنکھیں خلاؤں میں ساکت ہو گئیں۔

ایک بار پھر دروازہ کھلا۔ پرویز برآمد ہوا۔

خوبصورت سی دھن منہ ہی منہ میں گنگنا تالان میں بیٹھے جان کی طرف بڑھا۔

”چھٹی کرے آدمی تو ایسی کرے۔ گیارہ بجے اٹھے۔ اور موج کرے۔“

آتے ہی جان کی مقابل والی کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے اس نے اخبار اٹھالیا۔

پھر۔ جیسے چونکا۔

”جان۔“ اس نے اخبار واپس رکھ دیا۔

جان تو جیسے بت بنا دھرا تھا کرسی پر۔

”جان۔“ اس کے سفید چہرے اور ساکت آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے وہ

جلدی سے اٹھ کر پاس آ گیا۔

”جان۔“ اس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

مگر۔ جان اب بھی خاموش تھا۔

”جان کیا ہو گیا؟“

ابھی تھوڑی دیر قبل تو وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ناشتے کی میز پر اس سے باتیں کر رہا تھا۔ پھر اس سے اجازت طلب کر کے اس سے پہلے اٹھ آیا تھا۔ باہر دھوپ میں بیٹھنے کے لئے۔ اب اتنی سی دیر میں ایسی کون سی بات ہو گئی تھی؟

اس کا تو رنگ فق — اور جسم میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔

”جان“ — ایک بار پھر اس نے اسے زور سے جھنجھوڑا۔

اور پھر — کچھ فاصلے پر کھڑے ملازم کو مدد کے لئے بلایا۔

اسے سہارا دے کر وہ دونوں اسے اندر لانے لگے۔

جان کی گود سے دو تصویریں لڑھک کر میز پر جا گریں۔

اور — نیچے گھاس پر پڑا خط — اس کی ٹھوکروں میں آ گیا۔

”... میں نے تم سے صرف اور صرف اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ مجھے تم

سے بے پناہ نفرت ہے — ناجیہ احمد۔“

کھلے خط پر پردیز کی نظریں جا پڑیں۔ دوسرے لمحے تصویروں پر۔ اور

پھر — ہوا میں پھڑپھڑاتے پاکستان سے آئے لفافے پر۔

”اوہ۔“ پردیز فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

اس ناجیہ احمد نے بھی پہلی ناجیہ احمد کو دہرایا تھا۔

وہ کانپ سا گیا۔ کیا اب کے ’جان‘ جان جانبر ہو سکے گا؟

چلتے چلتے اس نے خط اور تصویریں سمیٹ لیں۔

اندر جا کر جان کو اس کے بستر پر لٹایا۔ کبل اوڑھائے۔ اور اب تو جیسے اس پر

بے ہوشی کی کیفیت بھی طاری تھی۔

پردیز خود اچھا سرجن تھا — مگر اس وقت تو جیسے اس کے بھی حواس کام نہیں

کر رہے تھے۔

جان کی ایرانی گورنس مادام لمیہ کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ بت کی

طرح کھڑی آنسو بہائے جا رہی تھیں۔

پرویز جوں توں کر کے اسے ہوش میں تولے آیا۔ مگر۔۔۔ جان کی حالت درست نہیں تھی۔ پرویز نے اسے وقتی طور پر ڈھنی سکون کی گولی دے دی۔
جان آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اور۔۔۔ پرویز مادام ملیجہ کی مدد سے اس کے کپڑے اور ضروری چیزیں اکٹھی کرنے لگا۔

کل صبح ہی صبح لنڈن میں پرویز نے ایک ضروری آپریشن کرنا تھا۔ اس کا وہاں پہنچنا ہر حال میں ضروری تھا۔

اور۔۔۔ یہاں۔۔۔ ایسی حالت میں وہ جان کو ایمسر ڈیم کے ہسپتال میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہاں کے بہترین ہسپتال میں داخل کروا کے خود اس کے پاس رہنا چاہتا تھا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے اس نے مزید انتظار کیا۔ سو کر اٹھنے کے بعد بھی جان کی حالت سنبھلی نہیں تھی۔ اس نے جان کے ذاتی پلین میں سامان رکھا۔
اور۔۔۔ جان کو لے کر سید حالنڈن جا پہنچا۔

وہ لنڈن کے بہترین ہسپتال میں وی آئی پی روم میں داخل تھا۔ قابل
 ڈاکٹروں اور لنڈن کے بہترین سائیکاٹرسٹ کے زیر علاج تھا۔
 آہستہ آہستہ بہتر ہو رہا تھا۔ وہ پہلے والا سکوت اور وحشت نہ رہی تھی۔
 ہاں۔ اداسیاں اب بھی آنکھوں میں ڈیرے ڈالے تھیں۔
 دکھ اب بھی مسکراہٹوں میں بسیرا کئے تھے۔
 وہ بہت کرب سے گزرا تھا۔ بڑی تکلیف اٹھائی تھی۔
 اس کی علالت کی خبر سکر بابا جان کا دم جیسے آنکھوں میں آ گیا تھا۔ دنیا اندھیر
 نظر آنے لگی تھی۔
 پرویز نے بھی دن رات ایک کر دیا تھا۔

اس ایک ماہ کے دوران بابا جان کے کاروباری اور غیر کاروباری دوست دور پار کے عزیز جو وہاں موجود تھے کبھی باری باری اسے دیکھنے آچکے تھے۔ پرویز کے جاننے والوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ خود جان کے جاننے والے بھی تقریباً اسے دیکھنے آچکے تھے۔ اب بھی سلسلہ جاری تھا۔ قریبی دوست اور ایک آدھ گرل فرینڈ اب بھی گاہے گاہے آتے رہتے تھے۔ انہی میں مہ پارہ بھی شامل تھی۔

شام ہو رہی تھی۔
جان کے کمرے سے نکل کر پرویز کوریڈور میں آتے ہوئے لفٹ میں گھس کر بجلی منزل پر اتر آیا۔
کوریڈور میں سے تیز تیز قدم اٹھا تا وہ ریسپشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔
اچانک — سامنے سے مجتبیٰ آتا دکھائی دیا۔
اسے اس کی شکل جان پہچانی سی لگی۔ پر کہاں دیکھا تھا؟ یاد نہیں آیا۔
مجتبیٰ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ فوراً قریب چلا آیا۔
مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
”مجتبیٰ۔“ وہ سمجھ رہا تھا پرویز اسے جانا پہچانا سمجھ کر پہچان نہیں پارہا تھا۔
”پچھلی گرمیوں میں شپ کروڑ پر ہم اکٹھے تھے۔“
”اوہ۔“ پرویز نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔
مگر — غیر شعوری طور پر اس کے ماتھے پر کئی بل پڑ گئے۔
یہی تو ناجیہ کا — شاید رشتہ دار وغیرہ تھا۔

ناجیہ — جس کی وجہ سے جان کی زندگی کے لالے پڑ گئے تھے، بریک ڈاؤن ہوتے ہوئے بچا تھا۔ جس کی وجہ سے بابا جان نے ہماری صدمہ بھیلنا تھا۔ اور جس کی وجہ سے خود پرویز نے کتنا دکھ کتنی پریشانی اٹھائی تھی۔ اسے تو ناجیہ کے نام سے

ہی نفرت ہو گئی تھی۔

اور پھر — اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ماتھے کے بل مزید نمایاں ہو گئے۔

مجتبیٰ کچھ کھسیا سا گیا۔ بہت بڑے لوگ تھے، عام لوگوں سے ملنا جلنا شاید پسند نہ کرتے تھے۔

”خیریت تو ہے؟“ مجتبیٰ کا اشارہ پرویز کی ہوسٹل میں موجودگی کی طرف تھا۔

”ہاں۔ وہ میرا کزن جان عالم ایڈمٹ ہے ادھر۔“

”اوہ — کیا ہوا انہیں؟“

”بس — ڈیپریشن...“ وہ بے کل سا نظر آنے لگا۔

اور — جان کو دیکھنے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی اس وقت پرویز کی بے رخی، بے کلی سی دیکھ کر — وہ ایسا کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔

پھر — دونوں اپنی اپنی راہ ہو گئے۔

پرویز ہاسپٹل سے باہر — اور مجتبیٰ اپنے دوست کے والد کی عیادت کرنے اسی کوریڈور کے آخری سرے والے کمرے میں۔



سردی زوروں پر تھی۔ تمام لنڈن برف کی زد میں تھا۔
 چھوٹی بڑی عمارتیں، اونچے نیچے درخت سبھی سفید لبادہ اوڑھے تھے۔ اس
 کے باوجود۔۔۔ زندگی کے تمام آثار موجود تھے۔
 وہی ٹریفک کا لاتناہی سلسلہ۔ وہی پیدل چلنے والوں کی ریل پیل۔
 رین کوٹ کے کالر چڑھائے۔ ٹوپی اچھی طرح درست کئے۔ مجتبیٰ تیز تیز چلتا
 سنٹرلی ہیڈ ہو سٹل کے دروازے میں جا گھسا۔
 وہیں۔۔۔ اور اسی رفتار سے آتی اسے مہ پارہ دکھائی دی۔
 ”ہائے۔“ قریب پہنچ کر وہ بولا۔ ”یہاں کیسے آئی تھیں؟“
 جانے کیوں وہ بے طرح گھبرا گئی۔

”وہ۔۔۔ وہ میری۔ ایک فرینڈ ہے اس کی ماں بیمار ہے۔۔۔“

”اوہ۔۔۔“

”میں چلوں۔“ وہ اب بھی خاصی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔

اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ آؤ میں اپنے دوست کے والد کو دمنٹ دیکھ آتا ہوں
پھر اکٹھے چلتے ہیں۔“ وہ اس کی حالت کو نہ سمجھتے ہوئے خوشگوار سے بولا۔

”مجھے بہت ضروری کام ہے۔“

جانے کیا ہو گیا تھا مہ پارہ کو۔ کچھ دنوں سے۔ اسے ملنے تو ضرور آتی
تھی۔ مگر اس پابندی سے نہیں جیسے پہلے آیا کرتی تھی۔

اور شاید اس کا وہم ہی تھا۔ اس کے رویے میں بھی وہ گرمی نہ رہی تھی۔ جو
پہلے ہوا کرتی تھی۔

آج بھی یہاں اسے چار پانچ دن بعد نظر آئی تھی۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

اسے بھی کون سا اس کے بغیر چین نہ آتا تھا۔

مہ پارہ جلدی سے باہر نکل گئی۔ مجتبیٰ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ اور
پھر سے۔ تیز قدم اٹھاتا اوپر کی طرف بڑھا۔

اسی کوریڈور میں۔ آج پھر اس کی ٹڈ بھیز پرویز سے ہو گئی۔ جانے کیوں
پرویز سے، جان عالم سے، اسے ایک طرح کا انس ہو گیا تھا۔ ناجیہ کے لئے اس
کے دل میں بہت جگہ تھی، بہت قدر تھی شاید اس لئے۔

”گڈ ایوننگ۔“ حسب سابق وہ آج بھی خود ہی پرویز کی طرف بڑھا۔

پرویز نے چونک کر اسے دیکھا۔ ہل بھر کو چہرے پر بے اطمینانی کے آثار
ابھرے۔ مگر پھر۔ آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگے۔ جیسے سوچا ہو اس تمام واقعہ
میں مجتبیٰ کا کیا تصور؟ اگر کچھ کیا تھا تو ناجیہ نے۔

یہ تو۔ بہت خلوص سے۔ بہت معصومیت سے ہر بار خود ہی پاس چلا آتا تھا۔

اپنے پچھلے رویے کا سوچ کر اسے افسوس سا ہوا۔
 ”گڈ ایونگ۔“ اس کے لبوں پر مبہمی مسکراہٹ ابھر آئی۔

مجتبیٰ کو حوصلہ سا ہوا۔

”مسٹر عالم اب کیسے ہیں؟“

”اب تو اچھا ہے بس ...“

”بس کیا؟“

”کمزور ہے اور — ڈیپر لیس ہو جاتا ہے اب بھی ...“

”اوہ — میں — انہیں دیکھ سکتا ہوں؟“

”نہیں — نہیں تم وہاں مت جانا۔“ وہ جیسے گھبرا کر بولا۔

مجتبیٰ کو دیکھ کر اسے کئی باتیں یاد آ سکتی تھیں۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا اسے۔

اور — مجتبیٰ کا رنگ مارے ندامت کے ماند پڑ گیا۔

مجتبیٰ کے خلوص میں ہی شاید کوئی بات تھی۔ پرویز کو اس کی حالت دیکھ کر
 پشیمانی سی ہوئی۔

”وہ — دراصل تاجیہ کی سگنی کی خبر سے جان بہت اپ سیٹ ہے — اور —

یہی سب اس کے یہاں تک آنے کا سبب بنا ہے۔ تمہیں دیکھ کر بہت ممکن ہے وہ

پھر — اس کی ذہنی حالت بہت کمزور ہے۔“

”اوہ۔“ مجتبیٰ اتنا ہی کہہ سکا۔

اور — کئی سوال ذہن میں لئے آگے بڑھ گیا۔

پرویز کا کبھی اپنا کبھی بیگانہ رویہ دیکھ کر۔ تو مجتبیٰ کی یہ بھی ہمت نہ پڑی۔ کہ پوچھ لیتا۔ ناجیہ کی منگنی کی خبر جان کو کس نے دی؟

اور۔ کہ اگر جان کو ناجیہ سے اس قدر لگاؤ تھا کہ اس کی منگنی کی خبر اسے ہوسپل تک لے آئی تھی۔ تو ایسی کون سی مجبوری تھی جو اسے ناجیہ کو خط یا اپنی خیر خبر دینے سے روکے رکھی تھی؟

کچھ عرصہ قبل۔ جب پاپا کو فون پر باتوں کے دوران انکل احمد نے ناجیہ کی ان کے بڑے بھائی کے بیٹے ناصر سے منگنی کی خبر سنائی تھی۔ تو مجتبیٰ نے سوچا تھا۔
جان عالم کی طرف سے کوئی خیر خبر نہ پا کر مایوس ہو کر ہی ناجیہ نے اپنے والدین کی خواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

اور۔ اس وقت تو۔ اسے بھی جان عالم کا شپ پر ناجیہ سے لگاؤ محض کھیل دکھائی دیا۔ وہ فلرٹ کر رہا تھا۔ ناجیہ کے ساتھ اور بس۔

کہاں جان عالم۔ ایک بزنس میکنٹ، ایک پوری شینگ لائین کا اونز۔ اور کہاں ناجیہ ایک بریگیڈیئر کی بیٹی۔

تب تک تو اس نے سوچا تھا۔ ناجیہ کی بے پناہ معصومیت اور بے تحاشہ خوبصورتی سے جان عالم دامن نہیں بچا سکا تھا۔ اور واقعی سنجیدہ تھا۔

مگر۔ جب اس نے ناجیہ کی کوئی خبر نہ لی یہاں تک کہ اسکی منگنی بھی ہو گئی۔ تو وہ سمجھ گیا۔

اس نے محض دل بہلایا تھا۔ فلرٹ کیا تھا۔ جو اس کی حیثیت کے لوگ عین اپنا حق سمجھ کر ہر ٹرپ اور۔ ہر پورٹ پر کرتے ہیں۔

مگر۔ آج۔ پرویز نے اسے کیا بتایا تھا؟

”... ناجیہ کی منگنی کی خبر سے جان بہت آپ سیٹ ہے اور یہی سب اس کے یہاں تک آنے کا سبب بنا ہے۔“

ناجیہ کی منگنی۔ اسے یاد آیا قریباً دو سال قبل وہ پاکستان گیا تھا۔ اپنی دو دھیال میں چند دن رہا تھا۔ اور پھر دو دن کے لئے انکل احمد کے گھر بھی۔

وہیں اس کی ناصر سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ آرمی میں کیپٹن تھا۔ خوش باش، ہر دم ہنسنے ہنسانے والا۔

ناجیہ کو بہت چاہتا تھا۔ بالکل اپنی بہن کی طرح۔ ناجیہ بھی کہا کرتی تھی۔ ناصر کو دیکھ کر اس کا یہ خیال جاتا رہتا ہے کہ اسے خدا نے بھائی نہیں دیا۔

ناصر کیساتھ اس کی چھوٹی بہن آسیہ بھی آئی ہوئی تھی۔ ناصر دونوں کو تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہا تھا۔

”نہیں ناجیہ۔ آسیہ کے ساتھ میں تصویر نہیں بنواؤں گا۔“ اس نے اپنا کمرہ

ناجیہ کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔ ”اتنی موٹی ہے لوگ کہیں گے خالہ کھڑی ہے۔“

اور۔ آسیہ نے جھٹ کیسرہ اسکے بھی ہاتھ سے لے لیا۔

”ٹھیک ہے تاجیہ ہا کے ساتھ بنوالیں۔“

”ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔“ وہ تاجیہ کی طرف بڑھا۔

تاجیہ بھی اس کے قریب آنے لگی

”اُ۔ اُ۔ تھوڑا فاصلہ رکھ کے۔“

”کیوں ناصر بھائی؟“ وہ پھر قریب ہو گئی۔

”باپ رے۔ اتنی نزدیک۔ میری گرل فرینڈ دیکھے گی تو کیا جواب

دوں گا۔“ وہ پرے ہٹ گیا۔

”میں تو اسی طرح نزدیک کھنچواؤں گی۔“ وہ پھر نزدیک بڑھی۔

”کیوں مرواتی ہو۔“ اب کے وہ ایک دو قدم تاجیہ کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

”اور اگر ہم آپ کی شادی ہی تاجیہ سے کر دیں تو پھر آپ کی گرل فرینڈ کیا

کہے گی۔“ آسیہ اچانک بولی۔

”میں۔ میں اس سے شادی کروں گا۔“ تاجیہ کے قریب آتے ہوئے اس

کی لمبی چوٹی اپنی گردن کے گرد لپیٹ اس نے یہ لمبی زبان باہر نکال لی۔ ”پھانسی

چڑھ جاؤں اس سے تو بہتر ہے۔“

اور۔ کلک کر کے آسیہ نے وہ پوز کیسرے میں محفوظ کر لیا۔

”You Cheat.“ وہ چلایا۔

اور۔ تاجیہ اور آسیہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔

”اوکے۔ اب سیر لیس۔ چلو آسیہ اتاروا ایک اچھی سی تصویر میری اس کے

ساتھ کیا یاد رکھے گی۔“

”نہیں رہنے دیں آپ کی گرل فرینڈ خفا ہو جائے گی۔“ اب کے تاجیہ دو

قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہنے لگی۔

”خفا ہو گئیں۔ اچھا پلیز۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسکے سامنے جا کھڑا ہوا۔

اور — ایک بار پھر — آسیہ نے دونوں کی تصویر اتار لی۔
 ناجیہ جب انگلینڈ آئی تھی — تو اپنی الم بھی ساتھ لے کر آئی تھی۔ اسی میں وہ
 دونوں تصویریں بھی لگی تھیں۔ بلکہ — مجتبیٰ کی نظریں اپنی الماری پر گئیں۔

جہاں — ناجیہ جب جاتے وقت اسی کمرے میں قیام کے دوران چند اور
 چھوٹی موٹی چیزوں کے ساتھ اپنا الم بھی بھول کر چھوڑ گئی تھی — تو مجتبیٰ نے سب
 چیزیں اکٹھی کر کے اسی الماری میں اوپر کے خانے میں حفاظت سے رکھ دی تھیں۔
 اور — جب پچھلے دنوں انکل احمد نے ناجیہ کی ناصر سے منگنی کا فون پر بتایا تھا۔
 تو جانے کیوں؟ مجتبیٰ نے اس کا الم نکال کر وہ دونوں تصویریں دیکھی تھیں۔
 جس میں ناجیہ اور ناصر اکٹھے تھے۔

”مجتبیٰ —“ ماما کی اچانک آواز پر وہ چونکا۔ ”چار بج چکے ہیں تم نے کہا تھا
 آج تمہارے دوست کی سالگرہ ہے ...“

”اوہ لیس ماما۔“ وہ جلدی سے بستر سے اٹھ بیٹھا۔

سوچوں میں اسے تو وقت گزرنے کا خیال ہی نہ آیا۔

وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔ چار بجے اس کے دوست نے بلایا تھا۔ کیک
 کٹنے کے بعد ان دونوں کا پکچر کا بھی پروگرام تھا۔ دیر سے سہی اس نے پہنچنا بہر
 حال تھا۔



آج اسے پرویز ہوسپتال کے قریبی ریسٹورنٹ میں ملا۔
 نظریں ادھر ادھر دوڑاتا وہ کسی خالی میز کی تلاش میں تھا۔ کہ دائیں طرف
 کونے والی میز سے پرویز نے ہی اشارہ کر کے پاس بلا لیا۔ وہ وہیں چلا آیا۔
 اور۔۔ اپنا اپنا ڈنر کھاتے ہوئے۔۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔
 آج۔۔ پرویز بالکل دوستوں کی طرح تھا۔
 ”تمہارے دوست کے والد اب کیسے ہیں؟“ پرویز نے ہی پوچھا۔
 ”آج شام آپریشن ہوا ہے۔ ٹھیک ہیں۔ مسٹر عالم کی طبیعت کیسی ہے؟“
 ”بہتر ہے۔ چند دن اور رکھ کر سوچتا ہوں لے جاؤں اسے گھر۔“
 ”ایمسٹرڈیم؟“ مجتبیٰ کے اندازے کے مطابق ریور رائین کی شپنگ لائین

کا اوزر ہونے کے ناطے اس کا گھرا میسٹرڈیم میں بھی ہونا چاہئے تھا۔
 ”نہیں۔ سردست وہاں نہیں۔ وہاں وہ اکیلا ہوگا۔ پھر سوچتا رہے گا۔ یہیں
 لنڈن میں ان کا گھر ہے وہاں لے کر جاؤں گا۔ میں بھی پاس رہوں گا۔
 اور پھر۔ فرینڈز بھی آتے رہتے ہیں۔“

اسے مہ پارہ کا خیال آ گیا کتنا خیال رکھتی تھی جان کا۔ روز ملنے آ جایا کرتی
 تھی۔ تمہیں شاید یاد ہو شپ پر ایک ایرانی لڑکی ہوتی تھی مہ پارہ۔ بہت اچھی
 لڑکی ہے۔ یہیں لنڈن میں رہتی ہے۔ روزانہ جان کے پاس آتی ہے۔۔۔“
 ”میسٹر عالم کے پاس؟“ اسے کچھ حیرت سی ہوئی۔

اور پھر اسے یاد آ گیا۔ چند روز قبل وہ اسی ہسپتال کے دروازے کے پاس
 اسے ملی تھی۔

مگر۔ کچھ گہرائی گہرائی سی تھی، بہت عجلت میں تھی۔

شاید اس کا خیال ہو کہ مجبئی کہ اس کا جان عالم سے ملنے کا پتہ چل جائے گا؟
 مگر۔ یہ اسکی بھول تھی۔ اسے اتنی بھی پرواہ نہیں تھی اس کی۔ کہ وہ کسی اور
 لڑکے سے ملتی تو اسے برا لگتا۔ شپ پر بھی وہ اولیت تو جان عالم کو ہی دیتی تھی۔
 جیسی تو ناجیہ پر بھی طنز کیا کرتی تھی۔

اسے حیرت ضرور ہوئی۔ کہ جان عالم نے اسے کیونکر اتنی لفٹ دے دی؟
 شاید وہ ڈیسپرٹ تھا اور ایسی حالت میں اسے مہ پارہ کا بھی سہارا اچھا لگا۔ یا
 پھر شاید۔ اس کے ساتھ لاشعوری طور پر شپ۔ اور شپ سے وابستہ ناجیہ کی
 یاد تھی۔

”ہاں۔ روز آ جاتی ہے۔ آنے کو اور بھی گرل فرینڈز آتی ہیں۔ مگر اس کو
 دیکھ کر اسے خاصی خوشی ہوتی ہے۔“

چند ٹاپے خاموشی رہی۔ صرف کٹھری کا شور سنائی دیتا رہا۔

”میسٹر عالم کو ناجیہ کی منگنی کی خبر کس نے دی؟ مجبئی نے آخر پوچھ ہی لیا۔ چند

سوال اس کے ذہن میں کھلبلی جو چائے تھے۔
 پرویز چونکا۔ پھر کانٹا اور چھری ہاتھ سے رکھ دیئے۔
 ”ناجیہ نے خود؟“ وہ اداس سا بولا۔
 ”ناجیہ نے خود؟“ مجتبیٰ حیرت سے بولا۔
 اس کے ہاتھ رک گئے۔

پرویز نے ایک گہری سانس لی۔
 ”ہاں۔۔۔ کچھ عرصہ پہلے اچانک ایک دن ناجیہ کا خط جان کے نام آیا۔ منگنی
 کی خبر کے ساتھ ساتھ بڑی تلخ باتیں بھی لکھی تھیں۔ ساتھ میں اپنے منگیتر کے
 ساتھ کھوئی دو تصویریں بھی تھیں۔۔۔“
 ”منگیتر کی تصویریں؟“ مجتبیٰ کو اور بھی حیرت ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ لگتا تھا بہت کلوز ہیں آپس میں۔ خط میں لکھا تھا اس نے اسے
 حوصلہ ہی اسی لئے دلایا تھا کہ وہ اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔
 بہت کچھ لکھا تھا۔ تلخیوں سے بھرا خط تھا۔ ٹامپ کیا ہوا۔ یہاں تک کہ اپنا نام بھی
 خود سائمن نہیں کیا تھا۔۔۔“
 مجتبیٰ سر جھکائے سنتا رہا۔ جیسے وہ بھی مجرم ہو۔

”اگر آپ مابینڈ نہ کریں تو میں ایک بات پوچھوں۔“ مجتبیٰ یوں بولا جیسے
 ایک مچھوٹا اپنے بڑے سے سوال کر رہا ہو۔ اور وہ بھی۔ ایک ذاتی سا۔

”Sure.“

جس طرح کہ آپ کی باتوں سے ظاہر ہے کہ مسٹر عالم ناجیہ کو اس حد تک پسند
 کرتے تھے کہ اس کی منگنی کی خبر برداشت نہ کر سکے۔ اس سے یہ بھی مطلب نکلتا
 ہے کہ انہوں نے ناجیہ کو صرف چاہا ہی نہیں تھا بلکہ اپنی شریک حیات بنانے کا بھی
 ارادہ رکھتے تھے۔۔۔“

”یقیناً ایسا تھا۔ اس نے ایک سسڑیہ سے لندن پہنچنے ہی اپنے بابا جان سے

بات کی تھی۔“

پرویز کو یاد آیا۔ دو ایک روز تو وہ بھی کھوئے سے پریشان سے رہے تھے۔ اس قدر مشابہت انہیں بھی چونکا گئی تھی۔ انجانے دوسو سے اور اندیشے سراٹھانے لگے تھے۔ وہم پرست نہ ہوتے ہوئے بھی جان کے مستقبل سے خوف آنے لگا تھا۔

مگر پھر۔ اپنے اکلوتے جگر گوشے کی پسند کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ”اپنے بیٹے کے لئے رشتہ مانگنے ہم خط لکھیں گے؟ فون کریں گے؟ نہیں۔ ہم خود جائیں گے پاکستان۔ اس کے والد کے پاس۔ اپنے جان کے لئے ان کی بیٹی کا ہاتھ طلب کریں گے۔ مگر یہ نام...“ ان کا اشارہ ناجیہ کے نام کی طرف تھا۔ ”بدلنا پڑے گا کیوں پرویز؟“

پرویز نے مدتوں بعد ان کے چہرے پر بھرپور طمانیت اور بے پایاں خوشیاں ناچتی دیکھی تھیں۔

”پھر؟“

انہی دونوں ماموں جان کو ایک میننگ کے سلسلے میں نیو یارک جانا پڑ گیا۔ اس کے بعد ڈل ایٹ گئے۔ ضروری نوعیت کے کچھ کام پڑ گئے تھے۔ اسلئے جلدی پاکستان نہ جاسکے۔ پچھلے مہینے کے پہلے ہفتے میں جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر۔۔۔

”اوہ۔۔۔ لیکن مسٹر عالم ناجیہ کو۔۔۔ میرا مطلب ہے کوئی فون یا خط لکھ کر اسے تمام حالات سے باخبر رکھتے تو شاید اس وقت چوہین کچھ اور ہوتی۔“

”لکھا تھا۔ دو خط لکھے تھے۔ یہیں لنڈن تم لوگوں کے ایڈریس پر۔“

”ہمارے ایڈریس پر؟“ جتنی بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

”ہاں۔۔۔ مگر ایک کا بھی جو ب نہیں دیا ناجیہ نے۔ پھر جان کی عادت کا تمہیں علم نہیں۔ وہ نیچے کبھی نہیں جاتا۔ تیسرا خط اس نے میرے کہنے کے باوجود

نہیں لکھا۔ بولا، دوسرا بھی اپنے اصول کے خلاف لکھا ہے۔ آگے بابا جان جانیں اور ان کا کام میں نے اپنی ڈیوٹی پوری کر لی ہے۔“
 مجتبیٰ الجھن میں پڑ گیا۔ خط گئے کہاں آخر؟
 ”ناجیہ شپ کروڑ کے بعد میں دن یہاں لنڈن رہی تھی۔ خط کیا انہوں نے اسی دوران لکھے تھے؟“

”ایک تو بقول اس کے ایسٹریڈیم سے لنڈن پہنچنے کے اگلے دن لکھا تھا۔ اور دوسرا اُس کا جواب نہ پا کر کوئی ہفتہ بھر بعد۔“
 ”اس کا مطلب ہے دونوں خط اسکی یہاں موجودگی میں ہی آنے چاہئے تھے۔ مگر — گئے کہاں؟“
 ”کیا مطلب؟“

”یہی کہ وہ یہاں باقاعدگی سے ان کے خط کی منتظر رہی تھی۔ جب کوئی خط نہ ملا تو جاتے وقت مجھ سے بولی۔ کوئی خط آجائے تو میں پاکستان بھجوادوں۔ اس کے بعد بھی میں تقریباً ڈھائی ماہ تک چیک کرتا رہا۔ کوئی خط نہیں آیا ان کا۔“
 ”یہ کیسے ممکن ہے؟“ پرویز بے طرح چونکا۔

”یقین کریں ہمارے یہاں ناجیہ کے نام کوئی خط نہیں آیا۔“
 ”تو — جیسی ناجیہ نے اس قدر تلخ باتیں خط میں لکھی ہیں۔ مایوس ہو کر شاید۔“

”بالکل ایسا ہے۔ اور اسی لئے اس نے مکتبی کے لئے بھی والدین کی نواہش کے آگے ہتھیار ڈالے ہیں۔“ مجتبیٰ کے شکوک کو تقویت ملی۔

”لیکن۔“ پرویز مسکرایا۔ ”اس نے تو لکھا ہے وہ ناصر کو پہلے سے چاہتی تھی۔ تصویروں پر بھی پرانی تاریخیں ہیں۔ اور — لگتا ہے واقعی بہت کلوز ہیں آپس میں۔“

مجتبیٰ کا رنگ بدل سا گیا۔ ناجیہ کی بے پناہ معصومیت کے پیچھے کیا کوئی گھناؤنا

رخ بھی ہو سکتا تھا؟

اس نے باتوں کا رخ بدل دیا۔ مبادا پرویز کوئی اور ایسی بات کہہ دے۔
جو اسکے دل میں ناجیہ کا اونچا مقام توڑ پھوڑ دے۔

※—※

یہاں سے دقت
دلت دلت
یہاں سے دقت
دلت دلت



رات مجتبیٰ کو دیر تک نیند نہیں آئی۔

جان عالم کے خط کیوں نہیں پہنچے تھے؟ وہ بار بار سوچتا۔

اُس کے خطوط نہ ملنے پر چوہیشن کتنی بدل گئی تھی۔ آج شاید ناجیہ کی منگنی
ناصر کی بجائے جان عالم سے ہوتی۔

پھر۔۔۔ اسے ناجیہ کا جان عالم کے نام خط یاد آیا۔

ناجیہ ناصر کو پہلے سے چاہتی تھی، یہ تو وہ جان عالم کو غصہ میں بھی لکھ سکتی تھی۔ مگر
تصویریں۔۔۔ پرانی تاریخوں والی بہت کلوز!

سر جھٹک کر اس نے سرہانے رکھا لیپ آن کر دیا۔ اٹھ کر باتھ روم گیا۔
واپس آیا۔ پردہ ہٹا کر بند کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔

بے مقصد ادھر ادھر دیکھا۔ مڑا۔
 جانے کیا خیال آیا۔ الماری کھولی۔ اور۔۔۔ اوپر والے ہیلف میں رکھنا جیہ
 کا البم اٹھالیا۔
 بستر میں آکر تکیوں سے ٹک لگا کر۔۔۔ آہستہ آہستہ صفحے الٹنے لگا۔
 معاوہ چونکا۔

نہایت نفاست سے لگائی گئی تصویروں میں سے ایک صفحے سے دو تصویریں
 غائب تھیں۔

اس نے جلدی جلدی باقی کے بھی چار صفحے دیکھ لئے۔ تمام البم پہلے کی طرح مکمل تھا۔
 ہر صفحے پر چھ چھ تصویریں لگی تھیں بالکل جیسے پہلے دن تاجیہ کے دکھاتے وقت
 اس نے دیکھی تھیں۔

اور پھر۔۔۔ ابھی کچھ عرصہ قبل جب انکل احمد نے فون پر تاجیہ کی ناصر سے ملنے
 کا بتایا تھا تب بھی اس نے یہ البم دیکھا تھا۔

خاص طور سے تاجیہ اور ناصر کی تصویریں دیکھنے۔۔۔ تاجیہ اور ناصر کی تصویریں!
 اچانک وہ زور سے چونکا۔

جلدی جلدی تمام البم الٹ پلٹ کر ڈالا۔ تاجیہ اور ناصر کی ہی تصویریں غائب تھیں۔
 ایک بار اور سارا البم دیکھ ڈالا۔ تمام البم مکمل تھا۔
 صرف وہی دو تصویریں نہیں تھیں۔

دو تصویریں۔۔۔ پرانی تاریخوں والی۔۔۔ بہت کلوز!
 اس کے ذہن میں شام ریٹورنٹ میں ڈنر کھاتے وقت پرویز کی باتیں گونجیں۔
 کئی سوال یا کئی شکوک ذہن میں سر اٹھارہ تھے۔

اس نے البم بند کیا۔ اٹھ کر الماری کا وہی ہیلف اچھی طرح دیکھا۔ باقی
 الماری بھی۔ ادھر ادھر۔ اپنی لکھنے کی میز پر۔۔۔ حتیٰ الوسع ڈھونڈنے کی کوشش کی۔
 کہیں نہیں تھیں۔



آج دنوں بعد مہ پارہ آئی تھی۔

اپنے کئی دن نہ آ سکنے کی معذرت کی۔ دراصل وہ اپنی دوست کی والدہ کی حمار داری میں کچھ اس قدر مصروف ہو گئی تھی۔ کہ وقت ہی نہ نکال سکی تھی اسے ملنے کو۔

”لیکن تم بھی تو نہیں آئے۔“ اس نے گلہ کیا۔

مجتبیٰ اس کی دوست کی والدہ کی حمار داری بخوبی جان گیا تھا۔
مسکرا دیا۔

”میں بھی تقریباً ہر شام وہیں جاتا ہوں جہاں تم جاتی ہو۔“

”میں — میں تو —“ مہ پارہ ہکلا سی گئی۔

”مجھے معلوم ہے۔“ مہ پارہ کا رنگ بدلتا ہوا۔ وہ مسکرایا۔

”تم اپنی دوست کی والدہ کے پاس جاتی ہو۔“

اور — مہ پارہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

”چلو تا با ہر گھومنے جاتے ہیں۔“

”چلو — میں نے کون سا ڈیوٹی پر جانا ہے۔“

”ہاں — تم نے پچھلی بار بتایا تھا۔ امریکہ میں تمہیں جاب مل رہی ہے۔“

”ہاں۔ اگلے مہینے کے تیسرے ہفتے پہنچنا ہے وہاں۔“ وہ الماری میں لنگا

جیکٹ اتار کر پہنتے ہوئے بولا۔

اور پھر — ماما کو بتا کر وہ مہ پارہ کے ساتھ گھومنے نکل گیا۔

”انکل احمد ریٹائر ہونے والے ہیں۔“ جانے کیوں رات سے برابر ناجیہ

اور اسکے خاندان سے متعلق باتیں اس کے ذہن پر چھائی تھیں۔

”تو۔“ مہ پارہ حسب معمول ناجیہ اور اس کے خاندان کے ذکر پر چوکر

بولی

چو — جیسے پہلے تو تمہیں اپنی وجہ سے — مگر اب واضح طور پر جان عالم کی وجہ

سے سمجھ رہا تھا۔

”چند ماہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد وہ یہاں آئیں گے۔“

”کیوں؟“

کچھ مشینری وغیرہ دیکھنے۔ وہاں وہ ٹیکسٹری لگوانا چاہتے ہیں۔“

”مجھے ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”I know.“

”مجھے تم اچھے لگتے ہو۔ اس لئے تمہیں اگر کسی اور سے ذرا بھی دلچسپی ہو تو

مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

وہ مسکرا دیا۔

”I know“

”اور اب بند کرو ان کے متعلق باتیں۔“
 ”تب تک ممکن ہے ناجیہ کی شادی ہو گئی ہو۔“ وہ پھر بولا۔

”My foot.“

”مجھے اس لئے خیال آتا ہے کہ — وہ — مسٹر عالم تھانا شپ اونر۔ وہ

چاہتا تھا ناجیہ کو ...“

بار بار ذکر کے مجتبیٰ جیسے کسی بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

ہونہہ — وہ کوئی اتنی اونچی چیز تھی کہ مسٹر عالم جیسا شپنگ ٹائیڈن اس کو چاہتا۔“

”نہیں — وہ واقعی چاہتا تھا اے۔“

”بالکل نہیں چاہتا تھا۔“

”تمہیں کیسے معلوم۔“ اس کا تجسس بڑھا۔

”شپ پر میں نے کئی بار مسٹر عالم کو اسکی بے عزتی کرتے دیکھا تھا۔“

”مگر — ناجیہ تو اسے چاہتی تھی نا۔“

”ہونہہ — اس لئے منگنی کر بیٹھی۔“ کچھ عرصہ قبل مجتبیٰ نے ہی اسے انکل احمد

کے فون اور ناجیہ کی ناصر سے منگنی کا بتایا تھا۔

”وہ تو والدین کی خواہش کے سامنے مجبور ہوئی ہوگی۔“

”والدین کی خواہش کیا۔ چاہتی ہوگی پہلے سے ناصر کو۔“

مجتبیٰ جیسے چونکا۔

”مگر — وہ تو مسٹر عالم کو...“

”بدلہ بھی تو لے سکتی تھی اپنی توہین کا۔ میں تو کہتی ہوں اسے

Encourage ہی اسی لئے کیا تھا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لے...“

مجتبیٰ مزید چونکا۔

اور پھر —

جیسے کڑیاں ملانے لگا۔ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔



مجتبیٰ جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا۔
 اسے کئی انکشافات کی توقع تھی۔ اسے پورا اعتماد تھا۔
 مقررہ وقت پر اپنا بریف کیس لئے وہ ہسپتال میں داخل ہوا۔
 آج۔۔۔ بغیر کسی جھجک کے اس نے پرویز کے لئے جان عالم کے کمرے کے
 دروازے پر دستک دی۔
 پرویز بی باہر نکلا۔
 ”خیریت؟“ پرویز مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولا۔
 ”آپ سے تھوڑا کام تھا۔“
 ”مجھ سے؟“

”جی ہاں۔“

”ٹھیک ہے میں ذرا جان کو بتا دوں۔“

اور۔۔۔ جلدی ہی وہ باہر آ کر اسکے ساتھ ہڈلیا۔

”پرویز صاحب۔ مسٹر عالم کو وہ خط ناجیہ نے نہیں لکھا۔“

نیچے لابی میں پہنچتے ہی مجتبیٰ گویا ہوا۔

”کیا مطلب؟“

”ان تصویروں کے متعلق ناجیہ کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ آپ کے یہاں

پہنچ گئی ہیں۔“

پرویز کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آئیے میں آپ کو بتاؤں۔“

مجتبیٰ اسے ہوسپٹل سے باہر قریبی ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

”آپ بیٹھے۔ میں کوئی لے کر آتا ہوں۔ پھر باتیں ہوں گی۔“ اس نے

ایک کونے والی میز پر پرویز کو بٹھایا۔ وہیں پاس ہی اپنا بریف کیس رکھا۔ اور سیدھا کاؤنٹر کی طرف گیا۔

پرویز اب بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ یوں ہی بیٹھا اسے آتے دیکھ رہا تھا۔

مجتبیٰ کوئی کے ساتھ بسکٹ لے آیا تھا۔

مسٹر عالم کو جو تصویریں بھجوائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک میں ناصر نے ناجیہ

کی چوٹی اپنی گردن کے گرد لپیٹی ہے۔ اور دوسری میں وہ ہاتھ جوڑے اس کے

سامنے کھڑا ہے۔ یہی ہیں نادونوں تصویریں؟“ کوئی کو کپ منہ بے لگاتے ہی

مجتبیٰ بولا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“ پرویز حیرت سے اسے تک رہا تھا۔

تصویریں واقعی ایسی ہی تھیں۔

مجتبیٰ نے اپنا بریف کیس کھولا۔ ناجیہ کا الہم نکالا۔

”یہ دیکھئے۔“ اس نے وہ صفحہ جہاں سے تصویریں نکالی گئی تھیں پرویز کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ دونوں تصویریں یہاں سے اڑائی گئی ہیں۔ یہ الہم ناجیہ کا ہے۔ یہاں وہ میرے کمرے میں مقیم تھی۔ جاتے وقت چند اور چھوٹی موٹی چیزوں کے ساتھ وہ یہ الہم بھی یہیں بھول گئی تھی۔ میں نے سب سنبھال کر اپنی الماری میں رکھ چھوڑا تھا۔ جب ناجیہ کی منگنی ہوئی تھی انکل احمد نے ہمیں فون پر بتایا تھا اسی دن میں نے یہ الہم نکال کر ناجیہ اور ناصر کی تصویریں دیکھی تھیں۔ یہیں لگی تھیں۔ کل یونہی الہم نکال کر دیکھا یہی دو تصویریں غائب تھیں۔ مجھے آپ کی بات یاد آگئی۔ دو تصویریں۔ بہت کفوڑ...“

پھر مجتبیٰ نے سے اپنے پاکستان جا کر انکل احمد کے یہاں دو روز قیام اور ان دونوں تصویروں کا بیک گراؤنڈ۔ سب بتایا۔

”کیا دو فرسٹ کفرز جو ایک دوسرے کو بھائی بہن کی طرح چاہتے ہوں ہنسی مذاق کے دوران ایسی تصویریں نہیں اتار سکتے؟“

پرویز۔ چپ سا سب سننا رہا۔

”مگر۔ یہ تصویریں تمہاری الماری میں رکھے الہم سے کس نے نکال لیں؟ اور۔ پھر۔ وہ خط تو پاکستان سے آیا ہے۔ لفافے سے، اس کے اوپر مہر سے صاف ظاہر ہے۔“

”کچھ بھی ہو سکتا ہے پرویز صاحب۔ کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ مہ پارہ کا مجھ سے ملنا جلنا ہے۔ ان تصویروں کے غائب ہونے پر مجھے شک ہوا۔ کل میں نے جان بوجھ کر ناجیہ اور مسٹر عالم کا مہ پارہ کے سامنے ذکر کیا۔ اور اس سے باتیں اگلوائیں۔

ناجیہ کی ناصر سے منگنی کا کچھ عرصہ قبل مہ پارہ کو میں نے ہی بتایا تھا۔

”وہ تو والدین کی خواہش کے سامنے مجبور ہوئی ہوگی۔“ باتوں کے دوران

میں نے کہا۔

”والدین کی خواہش کیا۔ چاہتی ہوگی پہلے سے ناصر کو۔“ وہ بولی۔
تو میں چونکا۔ اسی طرح کی بات بقول آپ کے ناجیہ نے مسٹر عالم کو خط
میں بھی لکھی تھی۔

”مگر وہ تو مسٹر عالم کو...“ میں نے پھر کہنے کی کوشش کی۔
”بدلہ بھی تو لے سکتی تھی اپنی توہین کا۔ میں تو کہتی ہوں اسے
Encourage ہی اسی لئے کیا تھا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لے۔“ وہ بولی۔
تو میرے شے کو تقویت پہنچی...“

”بالکل یہی خط میں بھی لکھا ہے۔“ پرویز تمام بات پر متعجب سا بولا۔ ”مگر
خط تو پاکستان سے آیا ہے۔“

پرویز صاحب اتنی گری ہوئی حرکت اگر کوئی کرنے پر آئے تو پاکستان سے
خط ڈلوانے میں کون سی مشکل ہے۔ جبکہ اسکی بہت کلوز فرینڈ آج بھی پاکستان میں
مقیم ہے۔ خود وہ پارہ کئی سال پاکستان میں رہی ہے۔ اسکا باپ ایران اکیمنسی
میں تھا۔ مہ پارہ اور اس کی دوست کی باقاعدہ خط و کتابت ہے۔
کیا چند مخصوص جیلے وہ اپنی دوست سے ٹائپ کروا کر مسٹر عالم کے ایڈریس
پر بھجوا نہیں سکتی تھی؟

شب کروڑ کے دوران مسٹر عالم کے کیمین میں جاتے میں نے خود مہ پارہ کو
دیکھا تھا۔ ان کا ایڈریس جان لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ خاص طور سے ایک ایسے
انسان کے لئے جو دل میں ایک گھٹاؤنی سکیم بنا چکا ہو...“
”اوہ۔“ پرویز اتنا ہی کہہ سکا۔

”آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ناجیہ کو خط ٹائپ کرنے کی کیوں ضرورت پیش
آئی؟“

”سوچا تھا۔ یہی بات تو سٹرائیک ہوئی تھی۔ پھر سوچا ایک معزز گھرانے کی

لڑکی ہونے کی وجہ سے شاید اپنی تحریر چھپانا چاہتی تھی۔ جیسی نام تک سائمن نہیں کیا تھا۔“

”بالکل۔ نام بھی سائمن نہیں کیا۔ اس لئے — کہ مہ پارہ جانتی تھی مسٹر عالم ناجیہ کے بہت قریب آ چکے تھے۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ شاید دیکھی ہوگی۔ اسی لئے وہ خود یا دوست کی ہینڈ رائٹنگ میں خط لکھوا کر کوئی رسک مول لینا نہیں چاہتی تھی۔“

پرویز کا رنگ سرخ تھا۔ بھنچی ہوئی مٹھیاں اندرونی تلاطم کی غماز تھیں۔

”اس کا مطلب ہے جان نے جو دو خط تمہارے گھر کے پتے پر ناجیہ کو لکھے تھے وہ بھی...“

ناجیہ کے یہاں بیس روز قیام کے دوران تقریباً ہر شام ہمارے یہاں آمد کے علاوہ میں نے مہ پارہ کو اکثر اپنی کھڑکی سے بہت صبح صبح ہمارے گھر کے آگے فٹ پاتھ پر گزرتے دیکھا تھا۔ تب مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ ایک تو وہ ہماری بالکل پچھلی سٹریٹ میں رہتی ہے دوسرے وہ روزانہ اپنے کام پر جایا کرتی تھی۔ اور مجھ سے ملنے کے بعد بقول اس کے اس نے اپنا راستہ یہی بنالیا تھا۔ یہیں سے ہو کر وہ بس اسٹاپ تک جایا کرتی تھی۔ مگر — اب سوچتا ہوں۔ تو یہی ذہن میں آتا ہے۔ ہمارا میل بوکس فٹ پاتھ پر چلنے والوں کی پہنچ سے زیادہ دور تو نہیں۔“

”تمہارے ساتھ خاصی بے تکلفی معلوم ہوتی ہے۔“

”ہاں۔ لیکن اس کے باوجود مجھ سے یہاں مسٹر عالم کی عیادت کے لئے آنا آج تک چھپا رہی ہے۔“

”اوہ۔“ پرویز کے شکوک کو بھی تقویت ملی۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ”تم نے اسے بتایا کہ تمہیں جان کی بیماری اور اس کے یہاں آنے کا علم ہے؟“

”نہیں۔ ایسا کرتا تو وہ محتاط ہو جاتی۔“

”I see.“ پرویز کو جتنی کی غلط فہمی اچھی لگی۔

کونی کا آخری گھونٹ لے کر اس نے کہ میز پر رکھا۔
 ”میں اس سے اگلو اؤں گا۔ جان کے سامنے اسے سب بتانا پڑے گا۔ اپنی
 اس مکروہ حرکت کا اقرار کرنا ہوگا۔“



یہاں تک کہ
 داتا گرام
 داتا گرام
 داتا گرام

پچھلے سال کی طرح آج ایک بار پھر وہ ہیر ڈز ڈیپارٹمنٹل سٹور کی بھول
بیلیوں میں گم ہو گئی تھی۔ پلک جھپکتے میں جانے آئی مصطفیٰ کہاں غائب ہو گئی
تھیں۔

ایسکلیپرز تک آ کر پریشان سی کھڑی وہ ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔ اس
فلور پر تو آئی کہیں نہیں تھیں۔ نیچے؟

مگر۔۔۔ اسے چھوڑ کر وہ نیچے کیسے جاسکتی تھیں؟
ایک بار پھر وہ مڑ آئی۔ تمام سائز پر گھومتے گھومتے اس کی ٹانگیں تھک گئیں۔
دوبارہ وہ ایسکلیپرز پر آ گئی۔ نیچے ہی اتری ہوں گی اس نے سوچا۔

اور۔۔۔ قدم آگے بڑھادیے۔

تیزی سے وہ نیچے کی طرف آرہی تھی۔
معا اس کی نظریں اپنے دائیں، مخالف سمت میں سرسراتے ایسکلیٹرز پر
پڑیں۔

اور پھر۔۔۔ جیسے اس کا دل اچھل کر اسکے حلق میں آ گیا۔

جان تھا۔۔۔ اوپر جا رہا تھا۔

وہی اتھارٹی تھی نظروں میں۔ وہی کمانڈ تھا شخصیت میں۔

وہی شاہانہ وقار تھا سراپے میں۔ وہی جاہ و جلال تھا انداز میں۔

مطلق العنان فرمانروا اپنی پوری جاہ و حشمت سے سامنے تکتا رواں دواں

تھا۔

تاجیہ نے رخ واپس موڑ لیا۔ اس کا دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔

مدتوں بعد اسے دیکھا تھا۔ کوشش کر کے اسے اپنے تئیں بھلا بھی چکی تھی۔ اب

تو دونوں کا آپس میں کوئی واسطہ بھی نہ رہا تھا۔ جان کا راستہ الگ تھا اور

تاجیہ کا الگ۔

مگر۔۔۔ پھر بھی جانے کیوں اس وقت وہ بے طرح بوکھلا گئی تھی۔

ٹپلی فلور پر پہنچتے ہی اس نے نجات کی سانس لی۔

سیڑھیوں سے چند قدم آگے بڑھ کر۔ وہ پھر نظروں ہی نظروں میں آنٹی کو

ڈھونڈنے لگی۔

”کس کو ڈھونڈ رہی ہو۔“ پاس سے آواز آئی۔

مانوس سی، مخصوص سی۔ دھیمی سی، مدھری سی۔

نظریں اٹھا کر اس نے دیکھا۔ جان ہی تھا۔

لبوں پر وہی مبہم سا تبسم۔ آنکھوں میں وہی اپنائیت۔

دھک، دھک۔۔۔ اس کا دل جیسے پنجر توڑ کر باہر آنے لگا۔

وہ تو اسی طرح تھا۔ سال بھر قبل جیسا۔۔۔

وہی مطمئن انداز لئے۔ وہی یگانگت لئے۔
 پھر اچانک جیسے وہ ہوش میں آگئی۔ جی چاہا۔ کھری کھری سنا دے۔ ساری
 دنیا سن لے۔

مال و دولت میں اس سے کم سہی۔ عزت نفس سے وہ ضرور مالا مال تھی۔
 اسے اگر اپنی دولت کا گھمنڈ تھا۔ تو وہ بھی اپنی پاکیزگی پر مغرور تھی۔
 اگر وہ ایک اونچی شخصیت تھا۔ تو وہ بھی فلرٹ کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی
 تھی۔

پورا ایک سال تو اسے شاید یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ تھی کس ملک میں۔
 آج اچانک دیکھ لیا تو نظروں میں اپنائیت بھری۔ فلٹریشن کا ایسا چمکا پڑا تھا۔
 کہ سمجھتا تھا کسی بھی لڑکی کو رام کر لے گا۔
 ”ہوں۔۔۔ بولونا۔“ وہ غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 مبہم سے تبسم میں شرارت رچ بس گئی تھی۔ اپنائیت بھری نظروں میں شوخی مکمل
 مل گئی تھی۔

ناجیہ کا جی چاہا۔ اسکا منہ نوچ لے۔
 بمشکل اس نے ضبط کیا۔ اور کوئی جواب دیئے بنا سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی۔
 وہیں آنٹی ایسکلیٹرز پر اترتی نظر آئیں۔
 ”کہاں رہ گئی تھی بیٹا۔“ وہ پھولی سانسوں کے درمیان بولیں۔ میں نے تو
 اوپر کا سارا فلور چھان مارا۔“

”وہیں تو میں آپ کو ڈھونڈتی رہی تھی۔“ وہ تادم سی بولی۔
 ایسا ہی ہوتا ہے اس شور میں۔ سائز اور گاہکوں کی رش میں گم ہو جاتا ہے بندہ۔
 چلو گھر چلیں، کھانا بھی پکا نا ہے جا کر۔“
 ڈیپارٹمنٹل شور سے نکل کر۔ وہ دونوں اپنے اپنے شوپنگ بیگ تھانے تیزی
 سے ٹیوب شیشن کی طرف بڑھیں۔

ٹوب سے اتر کر بس شاپ پر آئیں۔ اور بس میں بیٹھ کر گھر کے قریبی شاپ پر اتر گئیں۔

”آئی آپ چلے آرام کیجئے۔ کھانا آج میں پکالوں گی۔“
گھر میں داخل ہوتے ہوئے ناجیہ بولی۔

”شکریہ بیٹا۔ میں تب تک تمہاری امی کے ساتھ گپ شپ کر لوں گی۔“
وہ باہر ہی چھوٹے سے باغیچے کی طرف بڑھیں۔ امی آج ان کے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ گھر کے آگے باغیچے میں کرسی پر بیٹھیں مجتبیٰ کے سوٹر کے آستین بننے میں مصروف تھیں۔

ناجیہ سبزی وغیرہ لئے اندر کچن میں چلی گئی۔

وہ لوگ تین چار دن ہوئے لنڈن پہنچے تھے۔ ابو کو ریٹائر ہوئے ایک مہینہ ہوا تھا۔ چھوٹے پیمانے پر ایک فیکٹری پاکستان میں لگوانے کا پروگرام تھا۔ یہاں سے مشینری خریدنے اور چند ضروری معلومات فراہم کرنے آئے تھے۔ ناجیہ کے ساتھ ساتھ اس دفعہ امی کو بھی لیتے آئے تھے۔ کچھ آئی مصطفیٰ کا اصرار تھا اور کچھ ان کے میڈیکل چیک اپ کا بھی خیال تھا۔

دو ہفتے کے لئے آئے تھے وہ لوگ۔ حسب سابق ابواب بھی ہوٹیل میں ٹھہرے تھے۔ ناجیہ اور امی البتہ اکثر انکل مصطفیٰ کے ہاں ہوتیں۔ کیونکہ یہاں آئی مصطفیٰ انہیں باآسانی گھما پھرا سکتی تھیں۔

اس بار مجتبیٰ بھی نہیں تھا۔ اس نے تو جیسے پرویز اور جان کی ناجیہ کی طرف سے غلط فہمی دور کر دی تھی اور بس۔ فوراً بعد ہی امریکہ اپنی جاب پر چلا گیا تھا۔

لنڈن سے باہر گھومنے انکل مصطفیٰ یا ابو کے ہی فرصت پانے کا انتظار رہتا تھا۔ اور۔ ان دونوں کو کم از کم اس ہفتے بالکل فرصت نہیں تھی۔

گوشت بھونتے ہوئے اسے جان کا خیال آ گیا۔

اس کا گہرا اطمینان اور نظروں میں بھری اپنائیت یاد آ گئی۔

”امی ہم لوگ تیار ہوتے ہیں۔ ابو جاتے جاتے ہمیں آنٹی کے یہاں ڈراپ کر جائیں گے۔“ تاجیہ ٹاشٹے کے دوران بولی۔

”بیٹے میں نے تو آج یہیں ہوٹیل پر ہی کسی کو ٹائم دے رکھا ہے۔“ ابو شفقت سے مسکراتے ہوئے بولے۔ ”ہاں تم لوگ کہو تو چھوڑ آؤں گا۔“

”آپ تاجیہ کو چھوڑ آئیں۔“ امی کہنے لگیں۔ ”میں آج ادھر ہی ریٹ کروں گی۔ بالکل ہمت نہیں ہے، سخت تھک گئی ہوں یہ دو دن...“

پرسوں ور دگ بمعہ آنٹی اور انکل کے برہنگم چلے گئے تھے۔ وہاں امی کی ماموں زاد بہن رہتی تھیں۔

وہیں سے وہ لوگ قریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر واقع دنیا کے عظیم ڈرامہ نگار

شیکسپیر کی جائے پیدائش Stratford upon Avon گئے۔
شیکسپیرز برتھ پلیس گئے۔

دنیا کے کونے کونے سے اٹھ کر آئے ہوئے سیاح طواف کرتے نظر آ رہے تھے۔

انہوں نے شیکسپیر کا گھر دیکھا۔ صدیوں پہلے کے اس غیر معمولی ذہین انسان کے پیدائش کے پتہ گھوڑے سے لے کر اس کے سکول ڈیسک تک کی ہر چیز یہاں بہ حفاظت موجود تھی۔

گھوم پھر کر — ایک بار پھر — وہ سر اٹھائے کھڑی — شیکسپیر کے سیاہ دیو قامت مجسمے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”گھبراؤ نہیں۔“ پاس سے ہی مانوس سی مدھری آواز ابھری۔ ”شیکسپیر سچ مچ اتنا بڑا دیو نہیں تھا۔ اس کی مضبوطی یہ قد و قامت۔ اس کی تحریروں کی ہمہ گیر سچائیوں، اور ادب میں اس کے بے مثال مقام کی نشاندہی کرتے ہیں۔“
رخ پھیر کر اس نے دیکھا۔ جان تھا۔

آج پھر — آنکھوں میں شوخی، ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ عجیب شخص تھا۔ ماتھے پر کئی بل لئے اس نے سوچا۔ کہیں بھی، کسی بھی وقت نظر آ سکتا تھا۔

”تم چھٹی کے دن نہ آتیں تو وہاں بیٹھ کر۔“ اس نے قریب ہی ایک چھوٹے سے ہال کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سٹیج اور خالی کرسیاں نظر آ رہی تھیں۔
”شیکسپیر پر دیا گیا لیکچر سن سکتیں۔“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے وہ مزید بولا۔

اور — کچھ بھی کہے بنا وہ مڑ کر دور جاتے ابو امی، آنٹی انکل کے گروپ کی طرف بڑھی۔

آج بھی — چاہتے ہوئے بھی — وہ اسے کچھ نہ کہہ پائی تھی۔

کھری کھری جو اسے سنانے کو دل کرتا تھا۔ دل ہی میں رہ گیا۔
وہ لوگ این ہتھیاوے کے کوچ گئے۔ شیکسپیر این کو یہیں آ کر بلا کرتا تھا۔ اور
پھر اٹھارہ سال کی عمر میں اس سے شادی کر لی تھی۔
ابھی ابھی سی وہ ہر جگہ، ہر چیز دیکھ رہی تھی۔

لنچ انہوں نے شیکسپیر کے گھر کے مقابل ایک کینے میں کیا۔ وہیں وہ کینے بھی
دیکھی جہاں رات دیر تک شیکسپیر وقت گزارا کرتا تھا۔ اور — وہیں اس چھوٹے
سے میوزیم میں گھومے پھرے جہاں زندہ انسانوں سے مشابہ موم کے مجسمے شیکسپیر
کے مختلف ڈراموں کے مناظر پیش کر رہے تھے۔

پھر دریائے اے ون کے کنارے واقع رائیل شیکسپیر تھیٹر دیکھا۔ یہ شیکسپیر ہی
تھا جس کے ہر ڈرامے پر اس چھوٹے سے ٹاؤن میں بھی ایک ہزار پانچ سو بیس
سیٹیں پوری بھر جایا کرتی تھیں۔

گھوم کر وہ شیکسپیر میموریل فاؤنٹن کی طرف آنکلی۔

چپ چاپ بہتے پانی میں بطنیں تیر رہی تھیں۔

”تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ صدیوں پہلے انہی بطنوں کے آباؤ اجداد میں سے
ایک دو کو شیکسپیر نے بھی پال رکھا تھا؟“ ایک بار پھر جینٹ کی جیبوں میں ہاتھ
دینے قرعہ ہی بوٹ کی آڑ میں کھڑا وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

ایک سال قبل اُس نے یہی بات کی ہوتی تو شاید اُس کے لب و لہجے پر وہ بے
اختیار ہنس دیتی۔

”مگر۔ اس وقت۔ اُس کے گہرے مطمئن انداز پر ایک بار پھر وہ کھول
انٹھی۔

”این ہتھیاوے کے کوچ گئی تھیں؟“ وہ اُس کے بیزار چہرے کا ذرا بھی اثر
لئے بغیر اُس کے کوٹ کے کنارے پر کوچ کا کوچ دیکھتے ہوئے پھر کہنے لگا۔ ”پھر تو تم
نے وہ باز بھی دیکھی ہوگی جسے بھلا لگ کر ہر شام شیکسپیر این سے ملاقات کیا کرتا

تھا۔ تمہیں پتہ ہے این اُس سے آٹھ سال بڑی تھی۔ اور شادی کے پورے چھ مہینے بعد اُن کے یہاں ایک ننھی سی پیاری سی ...“

اُن سُنی کرتے ہوئے تاجبیہ نے ایک نظر پانی کے اُس سرے پر کھڑے انگل، ابو پرڈالی۔ وہ لوگ باتوں میں مشغول تھے، دھیان کسی اور طرف لگا تھا۔

اور یہ۔ بڑی ہوشیاری سے بوٹ کی آڑ لئے تھا۔

لیکن۔ یہ بوٹ نہ بھی ہوتی تو کیا وہ جھٹکتا؟ بات نہ کرتا اُس سے؟

نہیں۔ وہ بڑا ڈھیٹ تھا۔ اُس نے غصہ سے سوچا۔

اور۔ ایک بار پھر۔ دل کی دل میں لئے۔ وہ پرلی سمت تھیٹر کے کپاؤنڈ میں کھڑی آئی دای کی طرف بڑھی۔

شام کی چائے انہوں نے ”Hathaway tea rooms.“ میں

پی۔ اور۔ آس پاس کی دکانوں کے ساتھ ساتھ ”As you like it.“ سے بھی خریداری کی۔ وہی چھوٹی موٹی یادگار چیزیں جن میں سے ہر ایک پر فیکسپیر اور اُس کے میو ریل بنے تھے۔

رات رائیل تھیٹر میں ’مرچنٹ آف ونس‘ دیکھتے دیکھتے وہ چونکی۔

قریب ہی، آس پاس کی فضا۔ مانوس، مخصوص مدھری پر فیوم سے مہک اٹھی تھی۔

پچھلے سال کی طرح اس وقت بھی اُس نے انتظامیہ کے آدمی سے نرم دھیمے لہجے میں بات کی۔ تو اُسے یقین ہو گیا۔ یہ جان تھا۔

اتنے معروف آدمی کے پاس اتنا سا وقت کیسے آگیا تھا؟

صبح سے شام تک اسی چھوٹی سی جگہ میں گھوم پھر رہا تھا۔

کہیں اسی کی وجہ سے تو۔ ایک موہوم سا خیال ابھرا۔

نہیں۔ اس نے تلخی سے خیال جھٹکا۔ انگلینڈ میں لڑکیوں کی کال تھوڑی پڑ گئی

تھی۔

جھنجھلائی جھنجھلائی سی وہ سٹیج کو تک رہی تھی۔

پھر۔۔ اس نے محسوس کیا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے کچھ نکالا تھا۔ کاغذ اتارا تھا۔ اور جیسے کچھ کھانے لگا تھا۔

اسے یاد آیا۔ ایک مخصوص برانڈ کے چوکیٹ اسے بہت پسند تھے۔ پچھلے سال شپ کروڑ کے دوران بیزل میں ایک دکان پر اسے بالکل غیر متوقع مل گئے تھے تو وہ بچوں کی طرح خوش ہوا تھا۔ خود بھی مزے لے لے کر کھایا تھا اسے بھی اصرار کر کے کھلایا تھا۔

”چوکیٹ کھاؤ گی۔“ وہ اس وقت بھی آگے جھکتے ہوئے آرام سے اس کے کان میں بولا۔

ایک ہل کو تو جیسے اس کا دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔

مگر۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہوش کی دنیا میں آ گئی۔

وہ حد سے گزر رہا تھا۔ اور اب وہ مزید برداشت نہ کر سکتی تھی۔

لیکن۔ پاس والی کرسی میں آنٹی نے پہلو بدلا۔ تو اسے باقی سب کی بھی موجودگی کا احساس ہوا۔

بمشکل ضبط کرتے ہوئے وہ پھر سامنے دیکھنے لگی۔

اب اسے ڈرامے کی بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ خالی خالی نظروں سے مختلف کرداروں کو حرکت کرتے دیکھ رہی تھی۔

پھر۔ ڈرامہ اختتام کو پہنچا۔ ہال میں بتیاں روشن ہو گئیں۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں تم سے بات کرنا چاہوں گا۔“ ناجیہ کے سیٹ سے اٹھتے ہی وہ آہستہ

سے بولا۔

تو۔ وہ اسے ہی Follow کر رہا تھا۔ ناجیہ کے شے کو تقویت ملی۔

اس نے ایک نظر سائیڈ پر ڈالی۔ امی، ابو کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے

اسطینان سا ہوا۔

”مگر میں ایسا ہرگز نہیں چاہوں گی۔“ اس نے سختی سے کہا۔

اور — تیز تیز قدم اٹھاتی باہر کی طرف بڑھی۔

کسی بھی لڑکی کو ہاتھ سے جانے دینا۔ شاید اس کی دل لگی کے اصولوں کے

خلاف تھا۔ ہونہ — سختی سے سوچتی وہ سب کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔

رات گئے وہ لوگ برہنہ لوٹے۔

اگلے دن وہ لوگ لیک ڈسٹرکٹ چلے گئے۔ انگریزی کے معروف شاعر

ورڈزورٹھ کے شہر۔

جانے کیوں؟ آج بھی اسے دھڑکا سا لگا رہا۔ کہیں وہ یہاں بھی نہ آ جائے۔

مگر — ایسا نہیں ہوا۔

وہ مطمئن ہو کر لیک ڈسٹرکٹ میں کھوی پھری۔

لیک ڈسٹرکٹ — جہاں روح میں اترنے والی ہریالی تھی۔ مسور کن گنگنا تے

پانیوں کی جھیلیں تھیں۔ اور — وہ پہاڑ تھے۔ جہاں ورڈزورٹھ بچپن میں پرندوں کے

گھونسلے کھوجا کرتا تھا۔

”یہاں تو شاعر بننے کو دل کرتا ہے۔“ آنٹی بے اختیار بول اٹھیں۔

”ہاں۔ دل کرتا ہے۔ ورنہ تو لیک ڈسٹرکٹ اور اس کا تمام تر حسن کبھی کا

ورڈزورٹھ اپنے نام کر چکا ہے۔“ انکل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آؤ بیٹا۔“

ناجیہ نے چونک کر دیکھا۔ ابو تھے، اسے آنٹی مصطفیٰ کے یہاں چھوڑنے

جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

”اوہ۔“ وہ جلدی سے اٹھی۔ پچھلے دو دنوں کی سوچوں میں اسے تو وقت

گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ ”بس دو منٹ ابو ابھی تیار ہوتی ہوں۔“

اور — وہ ابو کے ساتھ آنٹی کے یہاں آ گئی۔

وہ زیادہ سے زیادہ سیر کرنا چاہتی تھی۔ گھومنا پھرنا چاہتی تھی۔ اس بار آئے جو چند دن کے لئے تھے۔

مگر— دیکھا۔ آنٹی بھی ٹھپ پڑی تھیں بستر پر۔

”کل زیادہ پھرنے سے ٹانگ میں پھر درد ہونے لگا ہے۔“ وہ بھی تھکی تھکی سی بولیں۔

اور— ناجیہ نے اکیلے جانے کی ٹھان لی۔

یہ باقی کے دو چار دن وہ گھر بیٹھ کر ضائع کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھی۔

اب تک وہ خود بھی کئی جگہوں سے بخوبی واقف ہو گئی تھی۔

اور پھر— آنٹی یا امی کی شکل میں کسی باڈی گارڈ کو ضرور ساتھ لے جانے کی

بھی یہاں چنداں ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

کچھ چیزیں آنٹی کو بھی چاہئے تھیں۔

پہلے بس اور پھر ٹیوب سے وہ سیدھی وکٹوریہ سٹیشن جا پہنچی۔

جانے کیوں وکٹوریہ سٹیشن اسے بہت پسند تھا۔

لوکل پارک، قریب سے لوڈ ہوتی لنڈن کی سیر کے لئے مخصوص بسیں، نزدیک

ہی سٹیشن کا پیار سا کیفے، ٹرینوں کی سرسراہٹ، ارد گرد ٹریفک کا بہتا سیلاب۔

اگر اسے پرسکون سبزہ زاروں، سنگتاتی ندیوں اور بھیکے موسموں سے عشق

تھا۔

تو یہاں لنڈن آ کر اسے احساس ہوا۔ کسی پارک میں یا اچھی سی کیفے میں بیٹھ

کر کسی زیور میں جھمکاتے نگوں کی طرح گلیوں میں بجی پر رونق دکانوں، بے شمار

انسانوں کے قدموں کی آہٹوں اور رواں دواں ٹریفک کو دیکھتے رہنا بھی کم

مزے کا نہیں تھا۔

شوہنٹ کرتے کرتے وہ تھک گئی تھی۔ گھڑی دیکھی دو بج چکے تھے۔ اسے

اچانک زور کی بھوک لگی۔

شوہنک بیک تھامے وکنوریہ سٹیشن كے كینے میں گھس گئی۔

كاؤنٹر پر سے برگر اور چپس لے كروہ كھڑكى كے پاس ايك خالى ميز پر آ گئی۔

شوہنك بيك ايك طرف ركھا، ٹرے ميز پر ركھی اور بيٹھ گئی۔

مزے لے لے كر برگر كھاتے ہوئے كھڑكى میں سے باہر ديكھنے لگی۔

وہی شور شرابا، وہی رونقیں تھیں۔ انسانوں كا سيلاب رواں دواں تھا۔

انہی میں كبھی معمر، كبھی ادھیڑ عمر اور كبھی جوان جوڑے بانہوں میں بانہیں

ڈالے پاس سے گزر رہے تھے۔

كچھ جوڑے ایسے بھی تھے جن كا آپس میں كوئی قانونی رشتہ نہیں تھا۔ اس كے

باوجود ايك دوسرے كے بہت نزدك آپس میں چپٹے چٹائے، ارد گرد سے بے

نياز چلے جا رہے تھے۔ كہ یہاں یہ سب برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ كوئی قید و بند نہیں تھا

ایسی باتوں پر۔

اب تو وہ بھی عادی ہو چكى تھی ایسے مناظر كی۔ كوئی نئی بات نہیں لگتی تھی اسے۔

”میں تمہیں بڑی دیر سے Follow كر رہا ہوں۔ یہاں تك آ كرم بھیڑ

میں كم ہو گئیں۔ اب اس فٹ پاتھ سے گزر رہا تھا تو كھڑكى میں تم نظر

آ گئیں۔“ اور آج پھر۔ اطمینان سے كہتا جان آرام سے اس كی مقابل والی

كرسى پر بیٹھ گیا۔

اس كے خوبصورت ماتھے پر كئی بل پڑ گئے۔

آدھا بچا برگر پیٹ میں واپس ركھ دیا۔

آج ہی نہیں وہ پرسوں بھی اسے Follow كر رہا تھا۔

اس كے سر دروئے كے باوجود آج پھر چلا آیا تھا اس كے پیچھے۔

آج وہ بولے بنا نہیں رہ سكتی تھی۔ كیا سمجھا تھا اسے اس نے؟

”آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ بہتر ہے مجھے اور Follow نہ كریں۔“ اپنا

ہینڈ بیک كندھے سے لٹكاتی وہ اٹھتے ہوئے سختی سے بولی۔

”اپنا لٹچ تو ختم کرو۔“ اس نے اسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

ایک جھٹکے سے اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

اس کے اس قدر فری ہونے پر وہ آپے سے باہر ہی تو ہو گئی۔

”خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔“ غصہ سے اس کا چہرہ سرخ اور تیز تنفس سے

نہنے نہنے پھول رہے تھے۔

وہ مسکرا دیا۔ دھیرے سے۔

ناجیہ باہر نکلی۔ وہ بھی پیچھے پیچھے چلا آیا۔

کچھ آگے چل کر وہ اپنی چیزیں سنبھالنے کے پارک میں چلی گئی۔

قریبی درخت کے نزدیک چیزیں ڈھیر کیں۔ جھنجھلائی جھنجھلائی سی درخت سے

ٹیک لگا کر بیٹھی اور اضطراری کیفیت میں ناخنوں سے پالش کھرپٹنے لگی۔

تنبہی۔ جان بھی وہاں آ گیا۔

میں Follow کرتے نہیں تھکوں گا۔ تم ہی بھاگتے بھاگتے تھک جاؤ گی۔

نتیجہ ظاہر ہے کیا ہو گا۔“ وہ درخت کا تاتھاٹھ کھڑا تھا۔

اور۔ ناجیہ پھر سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔

”نہیں۔ پلیز!“ دوزانو بیٹھتے ہوئے اس نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”چھوڑ دیں میرے ہاتھ۔“ وہ سختی سے بولی۔

”No, I love you...!...!...“

”اوہ۔ آپ ہنستے ہیں کہ نہیں۔“

”کیا کر لو گی پولیس کو بلا لو گی۔“ جانے کیوں اسے اس کی تیزی اور غصے پر

ہنسی آرہی تھی۔

”آپ... چاہتے کیا ہیں۔“ اس کے اس ’تعاقب‘ پر اسے حیرت بھی ہو رہی

تھی۔

”سمپل۔ تمہیں۔“

اور۔ اس کے مطمئن انداز پر وہ پاگل ہونے لگی۔

”مسٹر عالم۔“ اس نے اسے اسی نام سے پکارا۔ جس سے اس کے شپ کا فیجر اس کے شپ کا عملہ اور اس کے دھن دولت اور رتبہ سے متاثر باقی دنیا سے پکارا کرتی تھی۔ ”آپ مجھے نہیں چاہتے۔ آپ ہر لڑکی کو چاہتے ہیں۔ آپ بزنس میں ہیں۔ اس لئے یہاں بھی بزنس کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔“ اس نے پوری طاقت سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

اور۔ چیزیں لے کر چلتی بنی۔

ٹیوب میں۔ ایک بار پھر وہ اس کے پاس کھڑا تھا۔

”میں صبح سے تمہارے پیچھے لگا ہوں۔ مسٹر معصوفی کے گھر سے لے کر یہاں تک۔ بھڑ میں تم بار بار مجھ سے تم ہو جاتیں، ہر بار میں نے تمہیں ڈھونڈ نکالا۔۔۔“

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ اتنی دیر سے اتنی تکلیف کیوں کر رہے ہیں۔“

۔ “Because I love you.”

اور۔ ایک بار پھر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”اور۔ اس ایک جملے کے بدلے میں آپ سمجھتے ہیں کہ کئی اور لڑکیوں کی طرح میں بھی آپ کی دولت کی خاطر آپ کے گرد منڈلانے لگوں گی۔“

جان کے چہرے پر تاریک سا سایہ لرزا اٹھا۔

”یہاں دولت کا کیا ذکر ہے؟“

”ذکر ہے۔ اپنی دولت پر آپ کو کھمنڈ ہے۔ اپنی دولت کے بل پر آپ لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہیں۔ مجھے Follow کر کے جو آپ کا خیال ہے کہ ایک بار پھر آپ مجھ سے دل بہلائیں گے یہ آپ کا خام خیال ہے۔۔۔“

”میں نے اپنی دولت کے بارے میں کبھی اس خیال سے نہیں سوچا۔ نہ ہی میں نے کبھی اس کا غلط استعمال کیا ہے۔ میں جو تمہیں Follow کر رہا ہوں۔ یہ دل بہلانے کے لئے نہیں بلکہ۔۔۔ مجھے تم واقعی اچھی لگتی ہو۔۔۔“ تاریک سائے

اب بھی اس کے پرکشش چہرے کو گھیرے تھے۔
 ”کسی پاکستانی ناجیہ احمد سے بدلے لینے کی سکیم ابھی پوری نہیں ہوئی؟ کوئی
 کسر باقی ہے کیا؟“
 ”بدلہ؟“
 ”ہاں بدلہ۔“

اور۔ ٹرین کے رکتے ہی۔ وہ کھٹ پٹ کرتی اتر گئی۔
 بلا سوچے سمجھے ہی۔ اس نے جانا کہاں تھا؟ اتری کہاں تھی؟ یہ سوچنے کی
 اسے فرصت کہاں تھی؟
 یہ بیکر سڑیٹ تھی۔ وہ تیزی سے فٹ پاتھ پر ہوئی۔
 مڑ کر دیکھا۔ دور پیچھے لوگوں کے ہجوم میں حسب سابق اس کا پیچھا کرتا جان
 چلا آ رہا تھا۔

میڈم ٹساؤ کے مومی عجائب گھر میں داخلے کے لئے لوگوں کی قطار دیکھ کر وہ
 جلدی سے اس میں شامل ہو گئی۔ ٹکٹ خریدا۔ اور اندر داخل ہو گئی۔
 ادھر ادھر بلا مقصد گھومنے لگی۔ وہ تو پہلے بھی یہاں آ چکی تھی۔ اس بار شوق و
 تجسس سے نہیں، بلکہ جان سے پیچھا چھڑانے یہاں آئی تھی۔
 گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے دیکھا ٹریفالگر کی جنگ جاری تھی۔
 توپوں کی گھن گرج، آہ و بکا۔

اوہ۔ یہ کس حصے میں آ بٹکی تھی وہ؟ زخموں سے چورنیلن کو تو پچھلے سال بھی
 دیکھ کر۔ وہ سہم کر دوسرے پورشن میں چلی گئی تھی۔
 وہ آگے بڑھی۔ اور بھول بھلیوں میں الجھ کر گھبرا کر۔ ہارر جمیز میں آنکلی۔
 اوہ خدا یا۔ ظلم و دہشت کے دل ہلا دینے والے مناظر!

الیکٹرک چیر پر بیٹھا، مشہور زمانہ امریکن مجرم چہرے پر اذیت ناک کرب
 لئے کرنٹ کا منتظر تھا۔

معا سے اپنے کندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔
اور اس کی — زور سے چیخ نکل گئی۔

دیکھا۔ جان تھا۔ اب بھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے تھا۔
”اوہ۔“ اُسے دیکھ کر۔ اس دہشت ناک ماحول میں — جیسے ناجیہ کی
جان میں جان آئی۔

”بڑی بہادر بن رہی تھیں۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔
اور ناجیہ کو یاد آیا۔ وہ تو اُسی سے پیچھا چھڑانے یہاں تک پہنچی تھی۔
پھر سے اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ آگے بڑھ کر وہ ایک بار پھر — لوگوں
کے ہجوم میں شامل ہو گئی۔

اور — جان کا چہرہ اچانک تاریک ہو گیا۔ آنکھوں میں وحشت سی اتر آئی۔
باہر نکل کر۔ ناجیہ بس شاپ کی طرف بڑھنے لگی۔
”چلو۔“ آگے بڑھ کر جان نے اسے دبوچ لیا۔
اس کی گرفت اتنی سخت تھی۔ اس کے لہجے میں اتنی پھنکار تھی۔
کہ ہل بھر کو تو وہ سہم سی گئی۔
مگر — دوسرے ہی لمحے سنبھل گئی۔

”میں کہتی ہوں مجھے چھوڑ دیں میں نے گھر جانا ہے۔“ وہ تیزی سے بولی۔
”گھر ہی پہنچا رہا ہوں۔“ اس کے ہاتھ پر جان کی گرفت سخت اور لہجے میں
مگر ج تھی۔

تیز تیز چلتا وہ اسے تقریباً گھسینا ہوا لئے جا رہا تھا۔
”میں خود چلی جاؤں گی۔“ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔
”سیدھی طرح چلو“ بہت ہو چکا۔“ وہ دھاڑا۔
”اور۔“ وہ پھر سہم گئی۔“

”مجھے دیر ہو رہی ہے آنٹی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ قدرے توقف کے

بعد وہ پھر بولی۔ اب کے اس کا لہجہ سہا سہا سا تھا۔
 ”ایک لفظ اور نہیں۔“ باز وہ سہا سہا کر اس نے اسے ٹیوب میں چڑھا دیا۔
 خود بھی اس کے قریب سیٹ پر بیٹھ گیا۔
 ٹیوب چل پڑی۔ اور جزبز ہوتی تاجیہ نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔
 ”آپ مجھے لے جا کہاں رہے ہیں۔“
 جان پر تو جو ناراضگی تھی سو تھی۔ اس وقت تو اسے واقعی گھر پہنچنے کی فکر تھی۔ کہتا
 تھا اسے گھر پہنچا رہا ہے۔ جبکہ ٹیوب مخالف سمت میں دوبارہ وکنور یہ سٹیشن کی
 جانب چل رہی تھی۔
 جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تاجیہ نے دیکھا۔
 اس کے پرکشش چہرے پر تناؤ تھا، سختی تھی۔
 آنکھوں کا دبدبہ کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ شخصیت کا جاہ و جلال لائق ہی نظر آ رہا
 تھا۔
 جاہ و حشم والا فرمانروا جانے کیا ایکشن لینے والا تھا۔
 اُس کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔
 وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ خاموشی سے، پھر کچھ نہیں بولی۔
 وکنور یہ سٹیشن پر اتر کر وہ اسے ہاتھ سے پکڑے پکڑے قدرے فاصلے پر کار
 پارکنگ میں لے آیا۔
 وہیں اس کی خوبصورت سپورٹس کار رکھڑی تھی۔
 اس نے تاجیہ کے لئے اگلا دروازہ کھولا۔
 ”بیٹھو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔
 اور تاجیہ — چپ چاپ بیٹھ گئی۔
 وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر اب بھی سختی اور تناؤ تھا۔
 تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایک خوبصورت ریسٹورنٹ کے قریب گاڑی

روک لی۔

”آؤ۔“

اس کے لب و لہجے میں اتنا تحکم تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔
نہ یہ کہ وہ اسے یہاں کیوں لے کر آیا ہے۔ نہ ہی یہ کہ اسے گھر پہنچنے کی بھی
جلدی تھی۔

اندر جا کر وہ اسے کونے کی ایک میز پر لے آیا۔

ویٹر بس پاس آئی۔ اس نے کھانے کا آرڈر دیا۔ اور سامنے دیکھنے لگا۔

اب وہ خاموش تھا۔ بالکل۔

اور ناجیہ بھی۔ اس کی گہری خاموشی کو قبل از طوفان سمجھتے ہوئے چپ تھی۔
اگرچہ دل میں کئی سوال تھے، کئی باتیں تھیں۔ چہتے سوال، کھری کھری
باتیں۔

مگر یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔

اس نے اپنے اوپر اس قدر سنجیدگی — بلکہ غصہ طاری کر لیا تھا — کہ اس کی
ہمت ہی نہ بن پڑ رہی تھی۔

اور پھر — یہی سوال! یہی باتیں!

اس کے سن میں آٹھن ہونے لگی۔

اپنے سامنے بیٹھایہ آدمی اسے اور بھی برا لگنے لگا۔

عجب زبردستی تھی۔ وہ مجبور ہوتی رہی۔

”کھاؤ۔“ کھانا لگ چکنے پر اس نے ایک اور آرڈر دیا۔

”نہیں۔“ اس نے قوت مجتمع کی۔

”ویکھو۔ زیادہ تنگ نہیں کرو ورنہ...“ اس کے لہجے میں وارننگ تھی۔

اور — ناجیہ نے پلیٹ اپنے آگے کر لی۔

پل بھر کو جان کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

پھر۔ وہ اپنی لپیٹ میں کھانا نکالنے لگا۔

”میں پرسوں Stratford بھی لئے گیا تھا۔ کہ شاید تم سے بات ہو جائے مگر۔ تمہارے ساتھ لوگ تھے۔۔۔“

تو۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ وہ وہاں اسی کا پیچھا کر رہا تھا۔

ان لوگوں کے وہاں جانے کا اسے کیسے علم ہوا؟ یہ پوچھنا بیکار تھا۔ وہ جانتی تھی وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کہیں سے بھی پتہ لگا سکتا تھا۔

”مجھے معلوم ہے تم خفا ہو مجھ سے۔“ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ چہرے پر کی سختی اور تناؤ اب کافی حد تک مدھم پڑ گئے تھے۔ ”مگر اس کا یہ طریقہ تو نہیں کہ جہاں میں نے تم سے بات کرنے کی کوشش کی تم وہاں سے چلتی بنیں۔۔۔“

”میں خفا نہیں ہوں۔“

”دیکھو میں نے کہہ دیا ہے مجھے تنگ مت کرو۔“

بس اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔ ناجیہ کو ایک بار پھر غصہ آ گیا۔

اس کے بھی تو من میں سوال تھے۔ کئی باتیں تھیں۔

اول تو اس نے دہراتا ہی نہ چاہا تھا۔ کہ اب اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ کترا

کر لکھنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

مگر۔ اب۔ جبکہ یہ سننے سنانے کے موڈ میں تھا ہی۔ تو کیوں نہ وہ بھی کچھ

کہتی۔ کچھ سنتی۔

”میں آپ کو تنگ نہیں کر رہی۔ مگر اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ جب

کافی عرصہ مجھے آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تو میں سمجھ گئی تھی کہ آپ

صرف اپنا ٹائم پاس کر رہے تھے۔ پھر آپ کا خط بھی مل گیا۔ اس کے بعد میرے

والدین کی خواہش پر میرے کزن سے میری منگنی ہو گئی۔۔۔“

”Hold On۔“ وہ اچانک بولا۔ ”جب تمہیں میرا خط مل گیا تھا۔ تو تم

نے جواب کیوں نہیں دیا۔“ وہ کچھ الجھا ہوا سا، تجسس سا اور بے صبر سا لگ

رہا تھا۔

”اس خط کے بعد بھی جواب دینے کو کچھ باقی تھا کیا؟“ ناجیہ تلخی سے بولی۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ پہلے سے بھی زیادہ الجھ گیا۔

اور۔۔۔ ناجیہ مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں تلخی تھی۔ دکھ تھا۔

”آپ اپنے ذہن پر زیادہ زور مت دیں۔ آپ نے جو کیا ٹھیک کیا۔
 اور۔۔۔ میری متنی ہو گئی۔ اس پر بھی میں مطمئن ہوں۔ کیونکہ یہ میرے والدین کی
 خواہش ہے۔ اور آپ کو پتہ ہے والدین کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ بلکہ۔۔۔
 میں تو کبھی پچھلی باتیں سوچتی ہوں۔ تو لگتا ہے کوئی برا خوب دیکھا تھا۔
 اور۔۔۔ شکر کرتی ہوں کہ سب over ہو گیا۔ اور میں۔۔۔“

”Stop it Please Stop It.“۔۔۔ وہ اچانک چلایا۔

”اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی ہو۔ Twice as your Age۔ مجھے یہ بتاؤ
 کہ میرے خط میں ایسی کون سی بات تھی جس کی وجہ سے تم جواب نہ دے سکیں۔“
 ناجیہ نے خاموشی سے میز پر ایک طرف رکھا اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ چند ٹاپے
 کچھ الٹ پلٹ کرتی رہی۔ اور پھر ایک لفافہ نکال کر میز پر جان کے آگے سرکا
 دیا۔

کھانا دانا چھوڑ۔۔۔ جان نے لفافہ اٹھالیا۔

ایک طرف سے دیکھا۔ پھر دوسری طرف سے۔

پھر اندر سے خط نکالا۔ پڑھنے لگا۔

ناجیہ کی پلیٹ اب بھی خالی تھی۔

وہ خالی خالی نظروں سے جان کو خط پڑھتے دیکھنے لگی۔

”... تم جس دن سیریس ہو گئیں مجھے اپنے ڈرامے میں اور بھی لطف آنے لگا۔ جب
 تمہیں اپنے لئے روتے تڑپتے دیکھتا تھا میرے خفیہ جذبوں کی تسکین ہوتی تھی۔
 مدتوں بعد مجھے قدرت نے اپنا بدلہ لینے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ پھر کیسے میں اس

سنہرے موقعہ کو کھوتا۔ تمہیں خط لکھنا ضروری تھا ورنہ تم شاید خوش فہمی میں رہتیں کہ میری کوئی مجبوری مجھے تم سے رابطہ رکھنے سے روکے ہوئے ہے۔ میرا مقصد ایک پاکستانی عورت سے بدلہ لینا تھا۔ تاجیہ احمد، پاکستان آرمی بریگیڈیئر! اس سے بڑھ کر اور موقعہ مجھے کیا ملتا؟ مجھے اپنے کئے پر ذرا برابر بھی افسوس نہیں — جان عالم!“

خط پڑھتے پڑھتے اس کے رنگ بدلتے رہے۔
 پڑھ کر اس نے ایک بار اور الٹ پلٹ کیا۔ اوپر دیکھا۔
 F.A. + J.A. Lines ساتھ ہی نیلے پانیوں پر رواں دواں دو باد بانوں والی چھوٹی سی کشتی کی تصویر۔ جان عالم کے شینگ لائن کا نشان۔
 اس نے خط رکھا۔ لفافہ اٹھایا۔ پچھلا طرف پلٹا۔
 وہی F.A. + J.A. Lines ساتھ ہی پانی اور کشتی کی تصویر۔
 خط تو یقیناً مہ پارہ نے بھیجا تھا۔ مگر —
 ایک ہل کو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس خط پر تو کوئی بھی دھوکہ کھا سکتا تھا۔ مہ پارہ نے تاجیہ کو وہی باتیں لکھی تھیں جن کے سبب وہ تاجیہ سے خوفزدہ تھا۔
 مگر — مہ پارہ کو کیسے معلوم ہوا سب؟
 اور پھر — جیسے اس کے ذہن میں کوئٹہ سا لڑکا۔

پرویز جب شپ پر ڈانس والی شام تاجیہ کی نسلی کر رہا تھا تو بقول اس کے اس نے تاجیہ کو جان کی زیادتی کا بیک گراؤ بتانا ضروری سمجھا تھا۔ اس نے اس رات لاؤنج میں اسے سب بتایا تھا اور وہیں مہ پارہ بھی بیٹھی تھی۔ پرویز اردو میں تاجیہ سے بات کر رہا تھا کہ اس کے خیال میں مہ پارہ اردو نہ سمجھتی تھی۔ یہ تو — ہوسپٹل میں اس کی علالت کے دوران انہیں معلوم ہوا کہ مہ پارہ پاکستان میں رہی تھی اور اردو کے ساتھ ساتھ پشتو سے بھی واقف تھی۔
 اس کی مکاری پر وہ پکڑا سا گیا۔

اس نے لفافہ رکھا۔

اور — کچھ کہے بنا تیزی سے باہر نکل گیا۔

ناجیہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے یوں ہی بیٹھی — خط اور لفافے کو کھورتی رہی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس آ گیا۔ ہاتھ میں ایک خط کا لفافہ لے۔

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے لفافہ ناجیہ کے سامنے ڈال دیا۔

”اے پڑھو“۔

ناجیہ نے لفافہ اٹھایا۔ اندر دیکھا۔

خط اور دو تصویریں تھیں۔ اس نے تصویریں ایک طرف رکھیں۔ خط کھولا۔

اسی طرح ٹائپ کیا ہوا خط تھا۔ جیسے جان نے اسے بھیجا تھا۔ اس نے نیچے

دیکھا۔ نام بھی ٹائپ شدہ تھا۔ جان کے ہی خط کی طرح۔

وہ پڑھنے لگی۔

”... تم میں شان و شوکت تھی عقل بالکل نہیں۔ تم نے قدم قدم پر میری توہین

کی تھی۔ اس توہین کے بدلے تم نے مجھ سے پیار کی توقع کی؟ میں نے اگر تمہیں

حوصلہ دلایا تھا تو صرف اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے۔ تمہارا غرور توڑنے

کے لئے۔ تمہیں چکنا چور کرنے کیلئے۔

یہ دو تصویریں بھی دیکھ لو۔ تم سے ملنے سے بہت پہلے میں نامر کو چاہتی تھی۔

تمہاری اطلاع کے لئے بتاتی چلوں کہ پچھلے دنوں ہم دونوں کی ممکن ہو گئی

ہے نا

میں نے تم سے صرف اور صرف اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ مجھے تم سے بے

پناہ نفرت ہے۔ ناجیہ احمد“۔

ختم کر کے اس نے خط ایک طرف رکھ دیا۔

حیران و پریشان سی جان کو تکنے لگی۔

وہ مسکرا دیا۔

”تصویریں بھی دیکھ لو۔“ اس نے میز پر رکھی تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔
چونک کر اس نے تصویریں اٹھالیں۔
باری باری نظر ڈالی۔ ناصر کی اور خود اس کی۔
تصویریں تھیں۔

ایک میں ناصر اپنی گردن کے گرد اس کی چوٹی لپیٹے۔ دوسری میں اس کے
سامنے ہاتھ جوڑے۔
وہ سرخ سی ہو گئی۔

ناصر سے ہی اس کی متنگی کی خبر پا کر۔ پرانی تاریخوں والی یہ تصویریں دیکھ کر
جان نے اس کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی۔
”یہ... یہ تو بھائی ہیں میرے۔“ بدحواسی میں وہ بے اختیار کہہ گئی۔
اور۔۔۔ جان نے ایک جاندار تھہہ لگا لیا۔

وہ خفیف سی ہو گئی۔ ناصر اس کا منگیتر بھی تو تھا وہ اب بھی اسے بھائی کہہ رہی
تھی۔ جان اس کی بدحواسی پر کتنے زور سے ہنسا تھا۔
”اب تم اطمینان سے کھانا کھاؤ۔“ اس نے اس کی ہنوز خالی پلٹ کی طرف
اشارہ کیا۔ تمہیں میرے خلاف کس نے Poison کیا؟ مجھے یہ خط کس نے بھیجا؟
باہر سب تفصیل سے بتاؤ گا۔ اس وقت میں ایک ضروری فون کرتا ہوں۔“
وہ اٹھ کر ریسپشن کی طرف گیا۔

اور۔۔۔ ناجیہ ابھی ابھی سی کھانا کھانے لگی۔
ذہن میں ان گنت سوال کھلبلی چائے تھے۔ من میں بے شمار باتیں شور مچا رہے
تھیں۔

اس نے سامنے دیکھا۔
جان مطمئن تھا، پرسکون تھا۔ پچھلے سال سے بھی کہیں زیادہ کہیں بڑھ کر۔
کھانا کھا کر وہ اوگ باہر آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھے اور چل پڑے۔

تاحہ نظر پھیلی تروتازہ ہریالی نگاہوں کو سرور بخش رہی تھی۔ مچلیں چراگا ہوں
میں روئی کے گالوں جیسی نرم و سفید بھیڑیں چرا رہی تھیں۔ موسم بھیگا بھیگا تھا۔ اور
ہوا بخ بستہ۔

آبادی کافی پیچھے رہ گئی تھی۔

”آپ... آپ تو کہیں اور جا رہے ہیں۔“ ناجیہ نے چونسکتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“

”مگر کیوں؟“

”بس۔ میری مرضی۔“

”پلیز... کافی دیر ہو چکی ہے پہلے بھی۔ بری بات ہے۔“

ایک بار پھر۔ وہ زور سے ہنس دیا۔

وہ حیران سی اسے دیکھنے لگی۔

پھر۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ایک تھکی سی سانس لی۔

پچھلے سال شپ کروڑ سے لنڈن پہنچتے ہی میں نے تمہیں یکے بعد دیگرے دو

خط مسٹر مصطفیٰ کے ایڈریس پر لکھے تھے۔ جواب نہیں آیا تو میں نے تیسرا نہیں لکھا۔

میرا اصول نہیں۔ کچھ یہ بھی تھا کہ میں نے بابا جان کو تمہارے متعلق سب بتا دیا تھا۔ وہ

خود پاکستان جا کر تمہارے ابو سے بات کرنے والے تھے کہ اچانک کسی میننگ

کے سلسلے میں نیویارک جانا پڑ گیا اس کے بعد ڈل ایٹ دو تین ماہ لگ ہی گئے۔

واپس آئے اگلے مہینے کے پہلے ہفتے میں پاکستان جانے کا پروگرام بنایا۔ تو

تمہاری طرف سے لکھا گیا یہ خط مجھے مل گیا۔ ظاہر ہے۔

It was a sudden shock. کافی عرصہ مجھے ہوسپٹل رہنا

پڑا۔“

”ہوسپٹل؟“ ناجیہ پریشان سی بولی۔

”ہاں میڈم۔۔۔ کیونکہ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔“ اس نے شرارت سے

اپنے سر سے اس کا کندھا چھوا۔

”ہاں — تو — وہیں ہوسپتال میں پرویز کی ملاقات مجتبیٰ سے ہوتی رہی۔ یہی دو تصویریں اس پورے معے کو حل کرنے کا سبب بنیں۔ مجتبیٰ نے گھر جا کر تمارے اس الہم“۔ گلو بوکس کھول کر اس نے وہاں رکھے ناجیہ کے الہم کی طرف اشارہ کیا۔“ میں وہ دو تصویریں غائب پائیں — تو کڑیاں ملانا شروع کر دیا۔“ ناجیہ ہکا بکا سب سن رہی تھی۔

اور جان اسے بتاتا جا رہا تھا۔ کس طرح مہ پارہ نے جان کے دونوں خطوط منہ اندھیرے جا کر مجتبیٰ کے گھر میں لگے ان کے میل بوکس سے غائب کئے تھے۔ کس طرح اس الہم سے یہ دو تصویریں نکالی تھیں اور پاکستان میں مقیم اپنی دوست سے کس طرح جان کو خط ڈلوایا تھا۔

”پرویز نے ہوسپتال میں ہی مہ پارہ سے سب اگلوایا تھا۔“

”مگر ... مہ پارہ نے ... یہ سب کیوں کیا؟“

جان نے اپنے چوڑے کندھے خوبصورتی سے اچکائے۔

”I don't know.“

اس کے باوجود اس کے انداز میں جیسے اشارہ تھا۔ پچھلے سال شپ کروڑ کی طرف۔ جہاں مہ پارہ اکثر و بیشتر اس کے ساتھ نظر آئی تھی۔

اور — ناجیہ بے چین سی نظر آنے لگی۔

”اور — یہ جو تمہیں اس نے خط لکھا ہے ...“

”مگر — یہ لفافہ اور خط کا کاغذ؟“

یہ تو شپ میں تمہارے کیمین میں بہت پڑے تھے۔ چند کاغذ اور چند لفافے تو بعض پنجرز یا دگار کے طور پر بھی ساتھ لے جاتے ہیں —“ وہ خوشگوار سے

ہنسا۔

”اوہ“

”مجتبیٰ بہت ہی تائیس لڑکا ہے۔ میں اس کا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔“

”وہ تو ہے۔“ تاجیہ بے اختیار بولی۔

”میری شادی کا وہ سب سے معزز مہمان ہوگا۔“

تاجیہ پھر سے بے کل نظر آنے لگی۔

گو کہ اس کی متنی ہو چکی تھی۔ اب اس کے اور جان کے درمیان ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر — پھر بھی — اس نے ایمانداری سے اپنے دل کا جائزہ لیا۔

کیا وہ واقعی جان کو بھلا سکتی تھی؟ کیا وہ اکثر و بیشتر یاد نہیں آ جاتا تھا؟ مانا کہ جب بھی یاد آیا غصہ کے ساتھ یاد آیا۔ مگر یہ — غصہ بھی کیوں تھا؟

اور پھر — یہاں آ کر — جب پہلی بار وہ ہیرڈز ڈیپارٹمنٹل سٹور میں ملا تھا — تو کیا سارا وقت وقفے وقفے سے یاد نہیں آتا رہا تھا؟

پرسوں ہی — شیکسپیر کی جائے پیدائش پر — اور پھر وہیں میموریل تھیٹر میں جب اس سے ڈبھیڑ ہوئی تھی — تو کیا وہ تمام رات اس نے کروٹیں بدلتے نہیں گزاری تھی؟

اور آج — خاص طور سے جب بات کی صفائی ہو گئی تھی — اسے پتا چل گیا تھا کہ جان اسے بھولا نہیں تھا۔ بلکہ کسی اور نے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی سازش کی تھی۔

تو کیا — وہ — پھر سے۔

نہیں — نہیں — گھبرا کر اس نے سر جھٹکا۔ اب وہ ناصری امانت تھی۔

”آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟“ سنہیل کر تاجیہ نے پوچھا۔

”جلدی ہی۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

تاجیہ باہر دیکھنے لگی۔ مبادا وہ اس کے چہرے سے اس کی محسوسات پڑھ لے۔

”مجتہا کا فون آتا رہتا ہے۔“ وہ اسے کنکھوں سے دیکھتے ہوئے پھر کہنے لگا۔ ابھی چند روز پہلے بھی بات ہوئی تھی۔ تمہارے یہاں آنے کی اطلاع اسی نے دی تھی...”

”کیا؟“ رخ پھیر کر وہ اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں۔ دراصل۔ ساری بات جب کلیئر ہوئی تو مجتبیٰ جاب کے سلسلے میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے وہ ناصر کو برابر کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر کار اس سے بات ہو ہی گئی...”

”کون سی بات؟“

”یہی کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ صرف تمہارے ایک خط سے ہسپتال تک گیا۔ اور اگر تمہاری شادی کسی اور سے ہو گئی تو یہ نہ ہو میں دنیا سے ہی چلا جاؤں۔“ وہ رخ پھیر کر اسے دیکھنے لگا۔ ”ناصر بھی بہت اچھا لڑکا ہے جب اسے معلوم ہوا تم بھی مجھے ہی پسند کرتی ہو۔ تو فوراً تمہارے حق میں دستبردار ہو گیا...”

یکدم ہی تاجیہ کو ناصر کا منگنی کے اتنے عرصے بعد اچانک آکر اس سے شادی کرنے سے انکار کرنا یاد آ گیا۔

”گڈ لک“۔ خوش رہو...” اس کے الوداعی الفاظ اس کے کانوں میں

گو بجے۔

اس کے لب و لہجے پر وہ تب بھی ابھی سی اسے دیکھتی رہی تھی۔ مگر پھر سوچا تھا۔ یہ بھی اس کے ہنسنے ہنسانے کا ایک انداز تھا۔

”اوہ۔ نہیں۔“

”یس میم۔ اُس کے ساتھ منگنی تمہاری مرضی سے ہو جاتی وہ الگ بات

تھی۔ تب میں ایک لفظ بھی نہ بولتا مگر...”

”اب کیا ہوگا؟“ وہ پریشان سی بولی۔

”جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔“ خوبصورت سی دھن گنگنا تا وہ حسین مرغزاروں

میں سے گزرتا رہا۔

”مگر... ابو...“ وہ اب بھی پریشان تھی۔

یہ سب ابو کو پتہ چل جاتا تو؟

”تمہارے یہاں آمد کی اطلاع مجھے دے چکا تھا۔ میرے بابا جان تمہارے ابو سے بھی مل چکے ہیں۔ اور آج تھوڑی دیر پہلے جو میں نے ریسٹورنٹ میں فون کیا تھا وہ اپنے گھر کیا تھا۔ تمہارے والدین نے ’ہاں‘ کر دی ہے۔“

”پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ ان میں سے کئی باتیں اسے جان کی اپنی گھڑی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”سنو۔ ناصر نے صرف تم سے ہی نہیں تمہارے ابو سے بھی اپنی معذوری ظاہر کر دی تھی۔ تم پر اس نے کوئی بات نہیں آنے دی۔ ساری بات اپنے سر لے لی تھی۔ اب تم کہو گی کہ ناصر سے بات ختم ہوئی اور تمہیں پتہ نہ چلا۔ تو وہ شاید اس لئے کہ جب تک تمہارے والدین یہاں آ کر کسی صحیح نتیجے پر نہ پہنچتے وہ تمہیں سب بتا کر خواہ مخواہ پریشان نہ کرنا چاہتے ہوں گے۔“ وہ سڑک پر نظریں جمائے کہتا گیا۔ ”جب مجھے تمہیں تم لوگوں کے آنے کا بتایا تو بابا جان یہیں لنڈن رہ کر تمہارے ابو کا انتظار کرنے لگے۔ ملے۔ اپنی مدعا بتائی۔ انہوں نے سوچنے کی مہلت مانگی تھی۔ آج کا دن آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ بابا جان اور پرویز صبح تمہارے ابو اور امی کے پاس ہوٹل گئے تھے اور وہیں ’ہاں‘ ہو گئی۔

ابو نے آج صبح واقعی کسی کو ٹائم دے رکھا تھا۔ امی بھی وہیں ہوٹل میں تھیں۔ مگر ایسا تو ایک دوبار پہلے بھی ہو چکا تھا۔ کوئی نئی بات تو نہ تھی۔

”بس بس۔“ وہ دنوں بعد کھلکھلا کر ہنس دی۔

”اتنا سب کچھ ہو رہا تھا اور مجھے خبر تک نہ تھی۔“

”انہیں تو خبر تھی نا۔“

”کس بات کی؟“

”یہی کہ جس آدمی کے لئے تمہارا ہاتھ مانگا جا رہا ہے اسے تم پسند کرتی ہو۔
 بتاتے تو اس کو ہیں جس کو اس آدمی سے متعلق کچھ معلوم نہ ہو۔“
 اور—ناجیہ نے ایک گہری سانس لی۔
 ”یہ تو سب گھر پہنچنے پر ہی معلوم ہوگا۔“ اسے اب بھی سب مذاق لگ
 رہا تھا۔

”اچھا۔ سچ ہوا تو مجھے کیا دوگی؟“
 ”ان میں سے ایک بھی بات سچ نہیں ہے اور اب آپ پلیز مجھے گھر پہنچا
 دیں۔“
 ”گھر تو نہیں—وہاں میں بتا کر آیا ہوں۔ شام کو ہی لے کر جاؤں گا۔“
 گہرے اطمینان سے کہتے ہوئے اُس نے گاڑی کی رفتار تیز کر لی۔
 منٹوں میں ہی وہ قریبی دیہات میں پہنچ گئے۔
 سیدھی سڑک چھوڑ کر وہ اندر داخل ہوا۔
 کم آبادی، کم شور اور کم اونچی عمارتیں—یہ انگلینڈ کا گاؤں تھا۔
 وہ بازار میں داخل ہوا۔ تھوڑا آگے بڑھا۔
 اور ایک طرف گاڑی روک لی۔
 ”آؤ۔“

”کیوں؟“

”میں جو کہہ رہا ہوں“

اوہ۔ وہی اتھارٹی! وہی کمانڈ!

اتر کر وہ ساتھ ساتھ چل دی۔

دونوں ٹیلیفون بوتھ کے اندر چلے گئے۔

جان نے کوئین ڈالا۔ پرویز کے کلینک کا نمبر ملایا۔ پرویز لائین پر تھا۔

”Jan Here—ہیزل کو یقین نہیں آ رہا۔ تم اس سے بات کرو۔“

ساتھ ہی جان نے ریسپور تاجیہ کے کان سے لگا دیا۔

”اس سے تو بات بعد میں کروں گا۔ تم بتاؤ تم کہاں غائب ہو ایڈیٹ ...“
 تاجیہ کے کان میں پرویز کی آواز گونجی۔ ”صبح کی ہاں ہوئی ہے اور تم ابھی تک
 لاپتہ ہو۔ ماموں جان بیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ کہتے تھے کوئی اس بیوقوف کو پیغام
 دے کہ انگوٹھی تو اپنی پسند کی لے لے۔ ہیزل کو ساتھ لے کر اس کی پسند کے
 کپڑے تو خریدے۔ بقول ان کے کل جمعہ ہے مبارک دن ہے کل ہی نکاح ہوگا۔
 انہوں نے مٹھائی کا آرڈر بھی دے دیا ہے۔ سن رہے ہو ...“

تاجیہ دم بخود تھی۔

”ہیلو۔ جان۔“

”ہلو۔“ جان کان لگائے سب سن رہا تھا، ماؤتھ پیس میں بولا۔
 ”رات کلب میں میں نے ڈنر دیا ہے یا دوست اکٹھے ہوں گے۔“
 ”وہ کس خوشی میں؟“

”ارے گدھے تیرے نکاح کی خوشی میں۔“

”میرا نکاح؟“ جان جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔
 ”رخصتی، رخصتی۔“

”کیا؟“

”ماموں جان ایک سیکنڈ کی تاخیر کے قائل نہیں۔ کل ہی تیری شادی ہو رہی
 ہے۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ جلدی پہنچ۔ ساری تیاری کرنی ہے۔ بول کہاں سے رہا
 ہے؟ وہ ایک ہی سانس میں کہتا گیا۔

تاجیہ اسے ریسپور تھما کر آہستہ سے ہٹ آئی۔
 ”سٹن سے۔“

”وہاں کیا کر رہا ہے؟ اوہ۔ اب سمجھا۔ ہیزل بھی ساتھ ہے۔“ وہ جیسے
 ہوش میں آ گیا۔ ”جلدی آ جاؤ پلیز دونوں۔ بڑے کام ہیں۔ میں بھی بس

بند کرنے لگا ہوں کلینک۔“

”او کے۔“

اور—جان ناجیہ کو ہاتھ سے تھامے جلدی جلدی گاڑی تک آ گیا۔

دونوں بیٹھ چکے تو گاڑی شارٹ کی۔

اب وہ تیزی سے واپس چلا جا رہا تھا۔

ناجیہ چپ چاپ تھی۔ جو ہوا تھا اسے خواب لگ رہا تھا سب۔

ہیر ڈز، میس شیکسپیر برتھ پلیس میں، تھیٹر میں— اس سے ایک ایک ڈبھیڑ اس

کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔

تبھی وہ اتنا مطمئن ہو کر— اتنی اپنائیت سے اس سے بات کرتا تھا۔

جیسے ایک سال کا وقفہ درمیان میں حائل ہی نہ ہوا تھا۔

جیسے وہ ایک دوسرے سے دور ہوئے ہی نہیں تھے۔

”اب جواب دو میری بات کا۔“ جان سرور سا بولا۔

”کون سی بات؟“ اس کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ شرمایا شرمایا سا گھبرایا گھبرایا

ساتھا۔

”سچ ہوا تو مجھے کیا دوگی۔“

ایک پیاری سی، شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے خوبصورت لبوں پر ابھر آئی۔

پھر— اس کا سر جھک گیا۔

جان نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔

”بتاؤ نا۔“ اس کے اصرار میں کئی ہمید پنہاں تھے۔

ناجیہ کا سر اور بھی جھک گیا۔ چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔

جان نے گاڑی ایک طرف روک لی۔

رخ اس کی طرف کر کے اسے دیکھنے لگا۔

ناجیہ کی نظریں ایک لمحے کو اٹھیں۔

جان کی آنکھیں بہت کچھ کہنے کو بہتاں تھیں۔ مسکراتے لب کئی سربستہ راز لئے تھے۔

اس کی ہلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

Pakistanipoint ”بولونا—ہاں“۔

وہ بھیدوں کا، رازوں کا۔ تاب نہ لاسکی۔

Waqar تیور اگر ہلکیں گر گئیں۔

”مجھے ہیزل دے دو— پلیز!“ وہ اس کی بندر آکھوں پر جھک آیا۔

دن بھر کا تھکا ماندہ سورج مغرب کی اور بڑھ رہا تھا۔ مٹلیں گھاس میں چرتی

سفید مٹی سی بھیڑیں تاریخی کزنوں کا رنگ چرائے لئے جاری تھیں۔ نرم خرام ہوا

سرد تھی اور— وہ۔ اکاش کی دھتوں میں شاہانہ انداز میں تیرتا تھا عقاب

اونچائیوں کو چھو لینے کا، عظمتوں کو پالنے کا پیغام دے رہا تھا۔



یہ تو اس نے سالار کو بھی نہیں بتایا تھا۔ سیاہ نشیلی آنکھیں پوری کھول لیں۔ پرکشش لبوں پر شریر سی مسکراہٹ چل اٹھی۔ ”بہت خوبصورت“ SHE IS A PARAGON OF

☆ "رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔" وہ قرعی پوسٹ پر ثاقب کو فون پر بتانے لگا۔ "آدمی رات کو

اچانک باہر شور سنا کی دیا۔ ہم سب نے فوراً ہتھیار اٹھائے۔ اگلو سے باہر لپٹتے ہوئے پوزیشن بنے۔ جانی لیں۔ جب گارڈ نے بتایا کہ یہ دشمن نہیں تھا۔ ہوا یہ تھا کہ پہرہ دیتے وقت ہمیں اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ کہتا تھا اتنے میں اُس کو کسی نے زور سے تھپڑ مارا۔ دیکھا کہ سفید کپڑوں میں ملبوس بندہ ہے۔ کہتا ہے اس پوسٹ کی حفاظت کی خاطر ہم نے اپنی جانیں قربان کر دی ہیں اور تم سو رہے ہو۔“

☆ ”تو چپ کر۔ تجھے تو میں نے رکنے ہاتھوں جو ملک ٹریک پر گرل فریڈ کے ساتھ پکڑا تھا۔“
کیپٹن آصف نے کہا۔

☆ ”ڈیم اٹ۔ کینڈل لائٹ میں بھی کبھی حلوہ بنتا ہے۔“ کیپٹن نوید نے اُس کی گڑبڑاٹ یاد دلائی۔

”ہاں ماسر۔ کینڈل لائیٹ میں تو صرف ڈنرا اچھا لگتا ہے وہ بھی کسی لڑکی کے ساتھ۔“

☆ ”سر۔ اپنے قدم کا خیال رکھیں۔ راستے میں کر پولیسز کا خطرہ ہے۔ سنو کی پتلی سی تہ میں چبے ہوتے ہیں۔ اند میرے میں نظر نہیں آتے۔“

☆ THE MONSTERS IN THE DARK! - اُس نے سوچا۔

☆ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں آنٹی سمجھ نہ گئی ہوں کہ میں آپ کے پاس آئی تھی۔۔۔۔۔۔ اب تو مجھے نیند بھی آنے لگی۔“ وہ گہرائی سے کتنے لگی۔

☆ وہ مسکرا دیا۔ دلاویزی سے۔

☆ "SLEEP TIGHT, PAKISTAN ARMY IS AWAKE" اس نے خوبصورتی سے کہا۔

’زہیہ‘ کے بعد اب ’سو لجر‘-----

ایک فوجی افسر اور اُس کے جوانوں کی سیاحین میں سے ہزار فٹ بلند پوسٹ پر پہل پہل خطرات لگے۔ لکھنؤ کے خیر واقعات، بے شمار قبضوں اور لازوال محبت کی داستان ہے۔

’سو لجر‘ آمنہ اقبال احمد کی ایک اور خوبصورت تخلیق ہے۔